جملہ حقوق محفوظ

سلسلہ مطبوعات عصمت نمبر
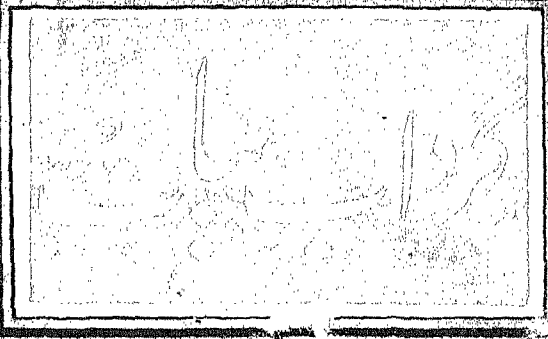
تصنیف

مصور غم حضرت علامہ راشد الخیری رحمۃ اللہ علیہ

جسے

رازق الخیری ایڈیٹر عصمت و بنات نے

عصمت بک ایجنسی دہلی سے شائع کیا

پہلی مرتبہ

اگست ۱۹۳۶

قیمت ایک [illegible]

یادگار مصوّر غم حضرت علامہ راشد الخیری علیہ الرحمۃ

رسالہ عصمت دہلی

ہندوستان بھر کے تمام زنانہ اخبارات و رسائل میں سب سے اچھا اور سب سے زیادہ چھپنے والا مشہور و معروف باتصویر ماہوار رسالہ ۴۲ سال سے کامیابی کے ساتھ جاری ہے عصمت ہندوستان کے مشہور ادیبوں اور ملک کی بہترین لکھنے والی خواتین کے اعلیٰ درجہ کے مضامین ۸۰ صفحوں پر ہر ماہ شائع کرتا ہے عصمت ہی وہ رسالہ ہے جو صوری و معنوی خوبیوں کے لحاظ سے شریف بیگمات کے لئے ہندوستان کا چوٹی کا رسالہ سمجھا جاتا ہے۔ سالانہ چندہ چار روپیہ (للعہ ر)

رسالہ بنات دہلی

حضرت علامہ راشد الخیری علیہ الرحمۃ نے ۱۹۲۷ء میں یہ ماہوار رسالہ مسلمان لڑکیوں کے لیے جاری فرمایا تھا۔ نو سال میں اس کا کسی ایک ماہ کا پرچہ بھی ایک دن کی تاخیر سے شائع نہیں ہوا عصمت کی طرح بنات بھی پابندِ وقت ہے۔ لڑکیوں اور بچیوں کے لئے بہترین مضامین سبق آموز نظمیں۔ مزیدار کہانیاں شائع کرتا ہے زبان اتنی آسان کہ گیارہ برس تک کی بچیاں سمجھ سکتی ہیں۔ سال میں ایک خاص نمبر شائع ہوتا ہے بنات باتوں ہی باتوں میں لڑکیوں میں مذہبیت پیدا کر دیتا ہے۔ سالانہ چندہ ایک روپیہ جو بذریعہ منی آرڈر بھیجا جائے۔ بذریعہ وی پی ۱عہ۔ نمونہ مفت۔ منیجر عصمت و بنات۔ دہلی

گردابِ حیات

مصورِ غم حضرت علامہ راشد الخیری (خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) کے مختصر افسانوں کے سات آٹھ مجموعے ان کی زندگی ہی میں شائع ہو گئے تھے جو ان کی دوسری تصانیف کی طرح اس قدر مقبول ہوئے کہ چند سال ہی میں پانچ پانچ چھ چھ مرتبہ چھپے۔ اس مجموعہ میں جو بعد وفات شائع کیا جا رہا ہے نصف کے قریب افسانے تو مصنف مرحوم ہی کے نام سے شائع ہوئے تھے لیکن نصف کے قریب افسانے وہ ہیں جو حضرت علامہ مغفور نے اپنے نام سے شائع نہیں کئے تھے۔ بعض افسانے عصمت کی ضرورت کے لئے تحریر فرمائے تھے اور بجائے اپنے نام کے ج۔ا۔ش وغیرہ حروف لکھ دیئے تھے اور بعض افسانے عورتوں کی طرف سے، عورتوں کی نہایت عام فہم زبان میں تحریر فرمائے تھے اور اپنی کسی عزیزہ کو مشہور کرنے کے لئے نہیں، فرضی عورتوں کے ناموں سے خواتین میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کرنے کی غرض سے شائع کئے تھے۔ چودہ پندرہ سال قبل تک جب خواتین ہند کے محسن اعظم خود عصمت مرتب فرماتے تھے بالعموم ہر پرچہ میں ان کے اپنے نام سے دو ایک مضمون ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ لکھتے تو بہت مختصر مضمون ورنہ عصمت کی ضرورت یا لڑکیوں کو مضمون لکھنے کی ترغیب دینے کے لئے اور کسی فرضی نام سے، مثلاً سنہ ۱۹۲۲ء میں۔ طلاق کے عنوان سے جو افسانہ شائع ہوا تھا وہ رسالہ کی سب سے آخری کاپی میں لکھا گیا تھا۔ پرچہ میں کمی تھی ایک افسانہ کی اور اس کے لئے بھی چار صفحوں سے زیادہ نہ نکل سکتے تھے۔ حضرت مصورِ غم اس افسانہ کو اپنے مخصوص رنگ میں لکھتے تو بارہ سولہ صفحوں سے کم کا افسانہ نہ ہوتا۔ اس پلاٹ کے ساتھ کردار نگاری۔ مناظر کشی۔ انشا پردازی مکالمہ نویسی وغیرہ کا کمال چار صفحوں میں دکھانا ناممکن تھا۔ اس لئے سیدھے سادے پیرایہ میں صرف واقعات بیان کر دئے گئے۔ اسی قسم کے بہت سے افسانے عصمت کی ضرورت کے لئے بہت ہی مختصر دو دو چار چار صفحوں کے تحریر فرمائے۔ عورتوں کی طرف سے جو افسانے تحریر فرماتے تھے وہ بالعموم سبق آموز آپ بیتی کہانیوں کے پیرایہ میں ہوتی تھیں۔ اور ان سے مقصد صرف اصلاح معاشرت ہوتا تھا نہ کہ فن افسانہ نگاری کی قابلیت ظاہر کرنا بلکہ علامہ مغفور تو انہیں افسانہ کہتے ہی نہ تھے۔

بہرحال وہ قصے کہانیاں ہوں یا داستانیں اور سرگزشتیں۔ ان میں رنگ افسانہ کا ہوتا اور انہیں کو پڑھ پڑھ کر متعدد خواتین افسانہ نگار بن گئیں اور ہزاروں عورتوں نے اپنی اصلاح کر لی اور زندگی کے بھنور سے نکل کر ساحل مراد پر پہنچ گئیں۔

رازق الخیری
۱۰۔ اگست ۱۹۳۶ء

فہرست

رازق الخیری

مطبوعہ محبوب المطابع دہلی

ڈائن ما

لاریب مسلمان عورت کی مصیبت موجودہ مسلمان مردوں کے دور میں یہ حق رکھتی ہے۔ کہ ہر ذی ہوش اس کا ہم نوا ہو۔ واقعات نے مجبور کیا ہے۔ کہ ہر وہ مسلمان جس کی آنکھ میں انصاف کا سرمہ اور دل میں ایمان کی روشنی موجود ہے۔ فرقہ نسواں کی تکالیف اور مصائب پر ٹھنڈے دل سے غور کرے۔ اور صرف اس لئے کہ اس کے اعضا طاقتور ہیں۔ کوّے کی طرح چڑیا کے بچوں کا نوالہ نہ بنائے۔ یہ صحیح ہے کہ طاقت حق رکھتی ہے۔ کہ کمزور کو فنا کر دے۔ مگر ایمان۔ ضمیر کی کسوٹی پر لعنت کا طوق پہنا کر ٹھکرا دیتا ہے۔ اسی اصول کے تحت میں مجروح جین جنگ قابل ہمدردی ہوں گے۔ ورنہ طاقت کا سوال اُن کے برخلاف قطعی فیصلہ کرے گا۔ اور یہی ہے۔ مذہب اسلام کا وہ زرین فیصلہ جس پر غور کرنے کے بعد غاصب سے غاصب اور سنگ دل سے سنگ دل انسانی ہستی بھی زبان سے نہیں تو دل میں کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی وقت اور کسی نہ کسی طرح ایمان لائے گی۔ اور ضرور لائے گی۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں۔ کہ عورت کا ہر فعل جائز ہو یا نہ جائز اچھا ہو یا بُرا، قابل ستائش سمجھا جائے۔ وہ عورت ہے معصوم نہیں ہے۔ اور اس کی غفلت اور خود سری نے کچھ کم آفت برپا نہیں کی۔ اور اس حالت میں وہ انتہائی

مصیبت میں بھی ہمدردی کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ کنبہ، برادری، محلہ، عزیز، شیبہ کی مصیبت، پر لاکھ سر پھوڑیں، مگر اُن کی یہ توقع کہ ہم بھی اُن کی طرح اُس کو بے گناہ سمجھ لیں، درست نہیں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ رات کے وقت آٹھ برس کے بچّے کا پانوں کے واسطے تن تنہا باہر بھیجنا مناسب نہیں۔ اُس کو یہ بھی معلوم تھا کہ ڈاکوؤں کا یہ گروہ جو "ایرانیوں" کے نام سے مشہور ہے، چاروں طرف ستم ڈھا رہا ہے۔ اُن کی عورتیں مردمار، اُن کے مرد جفاشعار، اُن کے بچّے خدائی خوار، یہ وہ سنگدل لوگ ہیں کہ اچھے اچھے، طاقتور اِن کے نام سے تھرّا رہے ہیں۔ اِن حالات میں۔ شبیہ کے ہوا خواہ یا طرفدار مجبوری، معذوری، قسمت، تقدیر جس کی چاہیں آڑ پکڑیں، مگر ہمارا منہ نہ کوئی کیل سکتا ہے، نہ کوئی ہماری رائے بدل سکتا ہے۔ ہم تو کہیں گے، اور کھلّم کھلّا، کہ شبیہ نے ادریس کو جان بوجھ کر کوئیں میں دھکّا دیا۔ چولھے میں ڈالا۔ بھٹّی میں جھونکا! بلکہ اِس سے بھی بدتر کوئی اذیّت ہو سکتی تھی، تو اُس کے پہنچانے میں کسر نہ کی۔ "ڈائن ماں" بھی زیادہ سے زیادہ اتنا کرتی کہ چند لمحہ کی اذیت پہنچا کر کلیجہ کھا لیتی۔ اِس کم بخت ماں نے تو وہ کیا۔ جو شاید دشمن بھی نہ کرے گا۔ اگرچہ صبر تو نہیں آتا۔ مگر اِس کے سوا اور کیا کہیں۔ ماں نے بچّے کو عمر بھر کے واسطے قید بامشقت کی سزا دی۔ اب شبیہ والے کتنی ہی باتیں بنائیں۔ مگر کوئی معقول انسان ایسی کٹّر ماں کے ساتھ واقعات سُن کر ہمدردی نہیں کر سکتا، وہ ایک دن پہلے سُن چکی تھی، کہ دو بچّے کھیلتے کھیلتے غائب ہو گئے۔ بھنگن نے اُس سے آ کر صاف طور پر کہا۔ کہ "بھٹیاری کا لڑکا یہ کمبخت ایرانی دن دہاڑے

آنکھوں ہی آنکھوں میں غائب کر گئے۔ سارے بازار نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھانے دار آیا سپاہی آئے۔ مگر کمبختوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایسا تلپٹ کیا کہ پھر پتہ نہ چلا۔ تین دن سے تھانے کا ٹانڈا پڑا ہوا ہے ''

ان خبروں کے سننے کے بعد بھی اگر شبیبہ نے رات کے وقت محض اپنے پانوں کے واسطے یہ اچھی طرح جان کر کہ گھر پر کوئی مرد نہیں ہے۔ ادریس کو بھیجا۔ تو اب یہ فیصلہ سننے والے ہی بہتر کریں گے کہ وہ کس قسم کی ماں تھی۔

(۱)

مبینی کچھ ایسی بڑی تحصیل تو نہ تھی۔ مگر چونکہ ریل وہاں سے کئی طرف جاتی تھی۔ اس لئے آبادی بھی خاصی تھی۔ دن کے دو بجے تھے کہ ایرانی خانہ بدوشوں کا قافلہ پہنچا۔ اُن کی طاقت کا اندازہ تو اسی سے ہو سکتا ہے کہ اُنہوں نے تیسرے درجے سے اوّل درجہ تک راستہ میں کسی مسافر کو نہ بیٹھنے دیا۔ پولیس اور ریل کا عملہ لاکھ سر پٹکتا رہا۔ مگر ان کے سامنے ایک پیش نہ گئی۔ ٹکٹ ایک کے پاس نہ تھا۔ مگر اُن سے دام وصول کرنے آسان کام نہ تھا۔ اسٹیشن پر اُترے تو کس کی اجازت۔ اور کیسا پوچھنا گچھنا۔ پلیٹ فارم سے لے کے مال گدام تک وہی وہ تھے۔ زمین اس کچرے سے پٹی پڑی تھی۔ مزے سے حقّے بجا رہے اور چولہے سلگا رہے تھے۔ مرد اور عورتیں عام طور پر تو نہیں۔ مگر اکثر گلے میں چمڑے کا ایک ایک تھیلا ڈالے ہوئے ہاتھوں میں چاقو نادعلی گلے کے روپیہ لیئے، بھولے بھالے لوگوں کو لوٹتے پھرتے تھے۔ حقیقتاً یہ روپے وغیرہ

سب جھوٹے تھے۔ وہ خود تیار کر لیتے ہیں۔ اور ایران کا عراب کا۔ اورنگ زیب کا اور شاہجہان کے عہد کا کہہ کر دنیا کو لوٹتے ہیں۔ اُن کے واسطے یہ تقریب کا ایک سلسلہ ہے۔ کہ اسی بہانے سے وہ بات چیت شروع کر دیں۔ جہاں کسی بدنصیب نے قیمت پوچھی اور جال میں پھنسا۔ دو پیسے کی چیز کے اُنھوں نے چار پانچ روپیہ بتائے۔ اور اب پوچھنے والے کی مجال نہیں، کہ خاموش ہو جائے۔

مسینی کے اسٹیشن پر اُن ہی کی ایک عورت کا ذکر ہے، ملنتر لنگی، موٹی، تازی، اِدھر اُدھر پھر پھرا کر۔ دہی بڑے والے کی دوکان پر آئی۔ اور سوا پانچ آنے کے دہی بڑے وہیں کھڑے کھڑے کھا گئی۔ انگلیوں سے چاٹتی تھی۔ ہاتھ سے منہ پونچھتی تھی، اور منہ چلا چلا کر پکوڑیاں اُڑاتی تھی۔ کھا چکی تو ایک پیسہ قیمت نہ دی۔ دکان دار نے دام مانگے تو چار پانچ گھرکیاں دے کر آگے بڑھ گئی۔ ایک رستہ چلتے گنوار کو ایک قفل دکھایا مشکل سے چار پانچ آنے کا ہوگا۔ اُس نے قیمت پوچھی کہنے لگی "ساڑھے چار روپے" گنوار آگے بڑھا۔ فوراً اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کہا۔

"چلا کہاں، ہمارے ملک میں قیمت پوچھنا، اور پھر خود قیمت نہ لگانا بہت بڑی گالی ہے۔ تو چاہے۔ ایک ہی روپیہ لگا، مگر لگا ضرور کہ ہم پر گالی نہ چڑھے"

غرض اِس بری طرح وڑبڑایا، کہ بیچارے کے منہ سے ایک روپیہ نکل گیا۔ اب کیا تھا، روپیہ لے لیا۔ اور وہ قفل حوالے کیا۔ جو وہیں کھڑے کھڑے بگڑ بھی گیا۔ اسٹیشن پر ایک اور سماں بھی دیکھنے کے قابل تھا۔ گاڑی میں ایک بڈھا بنیا معمولی پگڑی، اور میلی دھوتی باندھے

بیٹھا تھا۔ ایرانی عورت اس کی ٹھوڑی پکڑے ہوئے تھی۔ اور تھپڑ مار رہی تھی۔ لوگ جمع ہو گئے۔ پوچھا کیا ہے" کہتی کیا ہے۔

"میرا تھیلا اس کی گٹھڑی میں سے نکلا ہے۔ میں اس کو پولیس میں لے جاتی ہوں"۔

دانت پیس پیس کر کہتی تھی۔ اور بیچارے بڈھے کے تھپڑ اور گھونسے مارتی جاتی تھی۔ بمشکل تمام چار پانچ روپے لے کر پیچھا چھوڑا۔

ضرورت ہے۔ کہ ان خانہ بدوش عورتوں کے حالات پر نظر ڈال کر دیکھا جائے۔ کہ ہندوستان کی مسلمان عورت، اور اس ایرانی عورت میں فرق ہے، یا نہیں ہے۔ اور ہے تو کیا ہے، اور کیوں ہے۔ ان چند سطروں کے پڑھنے سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ فرق معمولی نہیں، آسمان اور زمین کا ہے۔ ہندوستان میں عام طور پر ایک عورت نہیں، دس، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اور شاید بہت زیادہ شریف عورتوں کی طاقت بھی اس عورت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اب سوال یہ رہتا ہے۔ کہ ایسا کیوں ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ جہالت اس کے بعد معاشرت۔ اور اس کے بعد بے پردگی۔

اگر اس کی وجہ صرف جہالت رکھی جائے۔ تو ہمارے ہاں جاہل طبقہ بھی ان کی برابری نہیں کر سکتا۔ اور اگر بے پردگی سمجھیں، تو ہماری بے پردہ اور جاہل اقوام بھی ان کی ٹکر نہیں کھا سکتیں۔ اس لئے بڑا دخل اس تغیر میں معاشرت کو ہو گا۔ کیونکہ معلوم ایسا ہوتا ہے۔ کہ ان کے لڑکے اور لڑکیاں جس قدر زیادہ شریر بدمعاش اور بے ایمان ہوں اسی قدر قابل تعریف ہیں۔

(۳)

ادریس، آٹھ برس کا بچہ ماں کے پانوں کے واسطے رات کے وقت اِن سنگ دل انسانوں کے پاس سے جاتا ہوا گزرا تو ایسا شکار یہ ظالم کیسے چھوڑ بیٹھتے جھٹ پکڑ لیا۔ بچہ کی رنگت زرد ہو گئی مگر وہ کیا پروا کر سکتے تھے۔ رات بھر پاؤں میں رسّی باندھ کر درخت کے نیچے سُلائے رکھا، اور کہہ دیا کہ "آواز نکالی، یا اُف کی تو جان سے مار ڈالیں گے" دو چار تھپڑ بھی خوب کس کر لگا دیے، اور فجر سے پہلے قافلہ احمد آباد روانہ ہو گیا۔ ادریس وہاں، پان نازو نعم کا بچہ دونوں میاں بیوی کی صورت سے جن کے اس وقت قبضہ میں تھا بینت کی طرح کانپ رہا تھا ان کی دونوں لڑکیاں اور ایک آٹھ برس کا لڑکا فرعون سے کم نہ تھے۔ جو اُٹھتے بیٹھتے جوتی اور لات کر رہے تھے۔ صبح چار بجے کا اُٹھا ہوا۔ ادریس رات کے گیارہ ساڑھے گیارہ بجے سوتا۔ دن بھر حقّے بھرتا پاؤں دباتا۔ آٹا گوندھتا بچہ بہلاتا۔ اور کھانے کو صرف ایک موٹی ٹکیہ اور دو چار کنکریاں نون کی مل جاتیں۔ اس آٹھ سال کے عرصے میں شاید ہی بھولے بسرے ایک آدھ تھپڑ اُس نے ماں کا کھالیا ہو تو کھالیا ہو، ورنہ ایک ایک ضد پر اُس نے ماں باپ کو ناک چنے چبوا دیے تھے۔ یا اب یہ کیفیت تھی کہ دن بھر دھوبی کا پٹڑا تھا۔

(۴)

ادریس کے لوٹنے کا انتظار گھڑی آدھ گھڑی تک تو بدنصیب ماں کرتی رہی، مگر جب انتظار کرتے کرتے آنکھیں پتھرا گئیں تو دل تڑپنے لگا۔ مگر گھر میں کوئی مرد نہ تھا۔ گیارہ بجے رات کے کس کی بجری کون ڈالے دانہ

گھاس، بھائی بمشکل تمام اُٹھے، اور دو چار جگہ پوچھ پاچھ چلے آئے۔ کہ نہیں ہے۔ رات جس طرح گزری وہ تو ماں ہی کا دل جانتا ہے۔ صبح چار ہی بجے سے اُٹھ کر باپ کے ہاں پہنچی، جب تک لوگ جاگ آئیں۔ قافلہ روانہ ہو چکا تھا، یہ تو اُسے کبھی اچھی طرح معلوم ہو گیا۔ کہ بچہ ایرانیوں کی بھینٹ چڑھ گیا۔ مگر کر کیا سکتی تھی۔ دن بھر دیوانوں کی طرح دیواروں سے سر پھوڑتی تھی۔ اور روتی تھی۔ شوہر کو اطلاع دی۔ وہ آیا۔ دونوں میاں بیوی چھ مہینے تک مارے مارے پھرے۔ مگر پتہ نہ چلا۔ تین سال ماں باپ کے رونے پیٹنے، اور اُدھر بیس کے قید و مصیبت میں بسر ہوئے ایک روز جب ایرانی عورت نے اس جرم پر کہ حقہ سلگا نہ تھا بھری ہوئی چلم اس طرح منہ پر ماری، کہ تمام منہ سوجھ گیا۔ تو آدھی رات کے وقت وہاں سے بھاگا۔ مگر تقدیر کا ایسا ہیٹا تھا، کہ ساتھ ہی ایرانی مرد کی بھی آنکھ کھل گئی اور وہ بھی پیچھے لپکا، اور تھوڑی دیر میں پکڑ کر لے آیا، اُلٹا درخت سے لٹکا دیا۔ اُدھر بیس درخت سے ٹنگا ہوا تھا۔ اور یہ لوگ نیچے سے اس کے رونے اور بلکنے پر قہقہے لگا رہے تھے۔

افسوس اس کے بعد کا حال مفصل نہیں، صرف اس قدر معلوم ہو سکا کہ اسی قسم کی اذیتوں سے اُدھر بیس ایک دن دنیا سے رخصت ہوا، بدنصیب، اب مردے سے بدتر ہے۔ مگر ہم کو یہ کہنے میں تامل نہیں، کہ یہ مصیبت اس کی اپنے ہاتوں لائی ہوئی ہے۔

عصمت ۱۹۲۱ء

(۱)

صبح سات بجے کا وقت تھا جب رضیہ کے والد میر احمد نے بی بی سعیدہ سے یہ کہلا کر بھیجا "میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ آپ کے صاحبزادے میاں سلیم کا معاملہ قابل اطمینان نہیں۔ مجھے آپ کی شرافت سے تو قطعی امید ہے کہ آپ رضیہ کو کسی طرح کا دھوکہ نہ دیں گی۔ مگر آپ جانتی ہیں کہ بیٹی ماں کی پونجی ہے۔ اور اس شفقت پدری کے علاوہ جو مجھے ہے یہ میرے پاس ایک مرنے والی کی امانت ہے۔ میرا دل کسی طرح نہیں ٹھکتا۔ اور میں مجبور ہوں۔ اگر آپ کے بھائی میر جمیل ضامن ہو جائیں کہ رضیہ کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچے گی تو مجھے عذر نہیں۔ آپ آئیے اور بیاہ کر لے جائیے"

(۲)

شام ہو چکی تھی میر جمیل بیٹھے ہوئے کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے کہ بی بی سعیدہ سلیم کو ساتھ لیے ہوئے بھائی کی خدمت میں حاضر ہوئیں میر احمد کا پرچہ آگے رکھا اور کہنے لگیں "یہ تو میں جانتی ہوں کہ سلیم سے آپ ناخوش ہیں، مگر میری تو اولاد ہے۔ بچوں سے قصور بھی ہو جاتے ہیں بزرگوں کا کام معاف کرنا ہے۔ میرا اب آخر وقت ہے۔ آنکھیں

کمزور ہوگئیں۔ ہاتھ پاؤں میں سکت نہیں رہی۔ جب میری زندگی میں کوئی اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے والا نہیں۔ تو میرے بعد کون پوچھنے والا بیٹھا ہے۔ میرے سامنے اس کا گھر آباد ہوگیا، تو گھر کا دروازہ تو کھلا رہے گا۔ دن بھر کا تھکا ہارا شام کو گھر آئے گا، تو ٹکڑا تو نصیب ہو جائے گا۔ یہ اب قصور پر نادم ہے۔ اور عہد کرتا ہے کہ اس معاملہ میں دغا کروں، تو خدا سے پاؤں۔ اور اس کا کیا ہے۔ ابھی تو میں خود زندہ بیٹھی ہوں، اگر اس نے ذرا بھی دیدے بدلے، تو ساری جائداد بہو کے نام کر دوں گی۔ آپ میرا اعتبار کیجئے۔ میں خدا کو ضامن کرتی ہوں۔ کہ بن ماں کی بچی سے دغا نہ کروں گی"۔ ابھی بی بی سعیدہ کی گفتگو ختم نہ ہوئی تھی، کہ اُدھر سے دونوں خالائیں، اِدھر سے ماموں آن پہنچے۔ اور کہا "ہاں میر مہدی، غریب بہن سچ تو کہتی ہے۔ اس دُکھیا کا وارث اب تمہارے سوا کون ہے۔ اس کا اپنا مالک اس کے سر پر موجود ہوتا تو یہ تمہارے پاس گڑگڑاتی کیوں آتی"۔ اِدھر یہ فقرہ ختم ہوا، اُدھر سلیم، ماں کے اشارے سے ماموں کے قدموں پر روتا ہوا گر پڑا۔ وقت اور معاملہ دونوں نازک تھے۔ میر مہدی، ضامن ہوگئے، اور صاضیہ کا نکاح ہوگیا۔

(۳)

سنگدل سعیدہ نے جو ابتدائی دنوں میں بھی یہ جائز نہ سمجھتی تھی، کہ میاں ایک پیسہ کا سودہ براہ راست بیوی کو لا کر دے۔ سب سے پہلی مرتبہ، وہ مٹھائی، اتفاق میں بھیجی۔ جو سلیم نے صاضیہ کو لا کر دی، اور اس نے میاں کے ساتھ تھوڑی سی کھا کر ساس کے پاس بھیجدی سلیم کی بڑی بہن محمودہ، اپنے بال بچوں سمیت آئی ہوئی تھی۔ مٹھائی کے

دوسرے ہی روز بی بی سعیدہ نے بیٹی کی معرفت ہوتے کہا "میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ آج کھانا تم خود پکا لو!" درد سر کا فقط نام تھا۔ آج سے مستقل کھانا پکانا رضیہ کے ذمہ ہو گیا۔ وہ نیک کوک کی بیٹی تھی، اس نے یہ خدمت سر آنکھوں سے انجام دی، مگر اس کا کیا علاج، کہ سلیم، کھانا کھانے بیٹھا، اور ساس، نندوں نے کہا "مرچیں بلا کی ہیں" "نمک کا پتہ نہیں" "مصالحہ میں ہراند ہے" "گوشت میں بساند ہے" "بیس دفعہ تمہاری بیوی کو بتایا۔ ان کو پکانا ہی نہیں آتا" یہ اور اسی قسم کی بیسیوں باتیں تھیں جو دن رات، ماں بہنوں کی طرف سے، سلیم کے کان میں پڑتی تھیں، اس ظالم کا عقیدہ صرف یہیں تک محدود تھا، کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ یہ عقیدہ بھی ایک آڑ تھی، ورنہ جس شخص کو نماز سے مطلب نہ روزے سے واسطہ اس کا عقیدہ کیا، اور اسلام کیا۔ رضیہ نے ان ہزار ہا بے گناہ بیویوں کی طرح، جو روسیاہ شوہروں کے ہاتھوں زندہ دفن ہوئیں، خدمت کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ اس بدنصیب کی دوسری بچی ساس نے زبردستی اس کی چھاتی سے چھین کر محلہ میں دے دی مگر اس نے اُف نہ کی۔

۴

داستان بڑی ہے۔ اور وقت تھوڑا مگر واقعہ سچا ہے۔ اس بدنصیب بچی کو جن قصوروں طلاق دی گئی، ان میں سے ایک یہ تھا، کہ اس نے تیسری بچی کے مرنے پر صدمہ نہیں کیا۔ ایک یہ کہ اس نے نند کے بچے کے پوتڑے کیوں نہ دھوئے۔ طلاق سے چار روز قبل جب اس کو ناکامی کا پورا یقین ہو گیا، اور اچھی طرح سمجھ گئی، کہ چوبیس گھنٹوں میں اٹھارہ

گھنٹوں کی لگاتار خدمت، جس میں گھر بھر کا پکانا، اور سینا پرونا، اور جھاڑو بہارو شامل ہے۔ بے کار گئی، تو وہ روزے دار بدنصیب، ایک روز قبل ساس کے قدموں میں گر تی، اور کہا "آپ اپنے لڑکے کا نکاح شوق سے دوسرا کر لیجئے۔ میری سات پیڑھی میں بھی کسی کو طلاق نہیں ملی۔ میرا کواری بچی کا ساتھ ہے۔ میں وعدہ کرتی ہوں، کہ ہر طرح کی خدمت اپنا فرض سمجھوں گی۔ اور مر کر یہاں سے نکلوں گی۔ آپ کو معلوم ہے۔ کہ میری ماں سوتیلی ہے۔ میرا ٹھکانا روئے زمین پر کہیں نہیں۔ طلاق کی نوبت نہ آنے دیجئے۔ اور آج سے بہو نہیں، ماما خیال کیجئے۔ میں آپ کی آپ کے لڑکے کی، اور بہو کی خدمت کروں گی، اور اپنی بچی کا پیٹ پالوں گی۔" جس وقت یہ عورت طلاق کے واسطے شوہر کے سامنے بلائی گئی، اس وقت وہ کانپتی ہوئی آئی، اور ایک ایک سے، رو کر کہا "میری مدد کرو۔" یہاں تک کہ زبان کی سچی ماں کی موجودگی میں بی بی) سعیدہ کے سعادتمند بچے نے رضیہ کی زندگی کا اپنے الفاظ سے خاتمہ کر دیا۔

عصمت، ستمبر ۱۹۲۳ء

مائیوں کی دُلہن

سمیعؔا، مائیوں سے فارغ ہوئی، تو رات کا پہلا حصّہ ختم کے قریب تھا، کوئی تزک و احتشام تو نہ تھا، مگر پھر بھی پاس کے عزیز بلائے گئے تھے، یہ کچھ دن بھر کے تھکے ہارے، کچھ سردی کا موسم، اس افیونی روزہ دار کی طرح جو پانی کا گھونٹ یا کھجور کا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہی پیالی منہ سے لگا لیتا ہے، رسم کے ختم ہوتے ہی بچھونوں پر لوٹ گئے، اور ایک گھنٹہ بھر کے بعد سمیعؔا، کی کوٹھری ہی نہیں، گھر کے دالان، اور کمرے پر بھی خموشی طاری تھی۔ بالکل اس شمع کا فوری کی مانند، جس کی صاف شفاف روشنی میں کبھی کبھی پروانہ کی قربانی خفیف سا رخنہ ڈالتی ہے ۔ اس گھر سے خراٹوں کی آواز میں ایک ٹھنڈا سانس بھی سُننے میں آجاتا ہے۔ یہ ممتا کی آگ میں ڈوبا ہوا سانس اس سینہ سے نکل رہا تھا جس پر چند گھنٹوں کی سمیعؔا، روزں، اور برسوں کی ہوئی۔ عمر کی متواتر منزلیں طے کیں۔ زندگی کی لگاتار سیڑھیاں پھلانگی، اور آج اس قابل ہوگئی، کہ اس گھر کو چھوڑ کر دوسرا گھر بسائے۔

سمیعؔا، سمجھ رہی تھی۔ کہ باپ کی طرح ماں بھی بے خبر ہے، اس نے

کھڑے ہوکر جھانکا، اور یہ دیکھ کر کہ ہر طرف سناٹا ہے۔ باہر آئی مہانوں پر نظر پڑی، تو نیند کے متوالے بے ہوش تھے، چھوٹی بہنوں کو دیکھا تو وہ بھی دبکی سکڑی پڑی تھیں، انگنائی میں آئی، خاموش رات کا سایہ سر پر تھا، تاروں کی محفل جمی ہوئی تھی، اور ان کی چمک دمک، فضاء آسمانی کو جگمگا رہی تھی، وہ کھڑی رہی، دیکھتی رہی، کہ کس اطمینان، و بے فکری سے چادر آسمان، اس افشاں کو لیے ہوئے ہر سمت پھیلی ہوئی ہے، اس کو اس بزم کے استقلال پر رشک آیا، وہ سوچنے لگی، ان تاروں کا وجود کس قدر خوش نصیب ہے، کہ ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر نہال، نہال ہیں، جدائی کی مصیبت سے محفوظ ہیں، خوش و خرم، مطمئن او بے فکر۔

متحیر و خاموش آنکھیں، آسمان پر جمی ہوئی تھیں، کہ ایک تارہ ٹوٹا اور آناً، فاناً غائب ہوگیا۔ اب سمیعاً، کو معلوم ہوگیا، کہ دنیا کا ہر ذرہ متحرک ہے۔ ہر حال متغیر ہے۔ اور ہر کیفیت منقلب۔

وہ بڑھی، دو چار قدم ٹہلی، اس نے دیکھا، کہ رات کے سناٹے میں، کس محبت، اور یگانگت سے نیم کی پتیاں ہلی جُلی، اپنی شاخوں میں پڑی سو رہی ہیں، وہ ٹھٹکی، اور کہنے لگی کتنی اچھی تقدیر ہے۔ ان پتیوں کی، ماں باپ کے آغوش میں، بہن بھائیوں کے ساتھ آرام کی زندگی بسر کر رہی ہیں! خیال کا اثر ابھی ذہن میں موجود تھا، کہ ہوا کا ٹھنڈا جھونکا چلا، ایک پتی ٹوٹی اور زمین پر گر گئی، اس وقت پھر سمیعا نے سوچا، اور کہنے لگی۔

"حقیقت یہ ہے، کہ دنیا کی کسی حالت کو قیام نہیں، ہر دوسرا لمحہ پہلے پہلے لمحہ کی حالت بدل رہا ہے۔ اور جو ہو رہا ہے، وہ ہو چکنے والا ہے، اکبر مرحوم نے کیا اچھی بات کہی ہے،

جو رو رہا ہے، وہ رو چکے گا، جو ہنس رہا ہو، وہ ہنس چکیگا،
سکونِ دل سے، خدا خدا کر، جو ہو رہا ہے، وہ ہو چکے گا،

میرے اپنے حال میں قدرت نے کیسے کیسے تغیرات کر دیئے۔ اور کیا سے کیا بنا دیا، اور آج یہ وقت ہے، کہ ماں باپ جیسے شفیق، اور بھائیوں جیسے رفیق، مجھ کو گھر سے نکال رہے ہیں۔ یہ روتے بھی ہیں، اور ہنستے بھی، رنجیدہ بھی ہیں، اور خوش بھی، مگر میں اب اس نتیجہ پر پہنچ چکی ہوں، کہ

ہمیشہ رہے، نام اللہ کا

ان کے رنج، ان کی خوشیاں، درگیتی اس ماں کی طرح، جو روتے بسورتے بچہ کو تھپک تھپک کر، لوریاں دے دے کر، سلا دیتی ہے، بالآخر ایک خاص حد تک، فنا کر دے گی، رفتارِ دنیا نے جو وقت سب بیٹیوں کو دکھایا، وہ مجھے بھی دیکھنا پڑے گا، کہ میں مہینوں ان کی آنکھ سے اوجھل رہوں گی، اور ان کا تعلق صرف اتنا باقی رہے گا، کہ یہ میری خوشی سُنکر خوش ہوں، اور رنج سُنکر رنجیدہ"۔

یہ خیال آتے ہی سمیعؔا، اُچھل پڑی، اور کہنے لگی، مگر "ہائیں، ایسا کیوں ہے، وہ سوچتی رہی، اور خود ہی فیصلہ کیا، کہ یہ قدرت کے قانون ہیں، وہ پاک انسان جو پیغمبروں، اور نبیوں کی صورت میں ہمارے سامنے آئے، انہوں نے بھی یہ ہی کیا، یہ وہ تھے جو عقائد مذہبی کے اعتبار سے۔ زمین و آسمان کے مالک تھے، بڑے بڑے جلیل القدر شہنشاہ اس قانون کو نہ توڑ سکے، اور ان کو بھی یہ ہی کرنا پڑا، یہ وہ تھے۔ جو اگر چاہتے تو چشم زدن میں کچھ کا کچھ کر سکتے تھے،

کیا یہ ماں یہ باپ، اور یہ بھائی مجھ سے، ایسے بے تعلق ہو جائیں گے،

کہ ان کا واسطہ صرف میری خوشی، اور رنج سے رہ جائے گا، خیر اس کا جواب تو مستقبل دے گا، مگر یہ جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس میں میرے والدین نے کچھ لغزش تو نہیں،

مرد کی کتاب زندگی کا دیباچہ اس کا بچہ۔ اور عورت کی زندگی کی تمہید اس کی لڑکی مسلمہ فیصلہ ہے، اس وقت جس شخص کے ہاتھ میں میرا ہاتھ دیا جا رہا ہے، اس نے کن خیالات کی پرورش پائی۔ اس کے گرد وپیش کیسے لوگ رہے، یہ تمام باتیں قابل اطمینان ہیں، اور یہ بھی دیکھنے کی تھیں، کہ جس شخص سے واسطہ پڑ رہا ہے، وہ اپنے فرائض کا احساس رکھتا ہو، باپ نے اپنے لڑکے کو سامنے رکھ کر، اور ماں نے اپنے بیٹے کے حالات سے واقف ہو کر ہم سے جو وعدے، اور اقرار کیے۔ ان کا پورا کرنا فرض اولین ہے، اور میں مطمئن ہوں، کہ ایک ایسے گھر میں جا رہی ہوں، جہاں میں اپنے جائز حقوق سے متمتع ہوں گی۔"

اس وقت سمیعا کے دل میں مسرت کی ایک لہر دوڑی، مگر پھر اس کو یہ خیال آیا۔ کہ

"میں خوبصورت نہیں ہوں میں دولت مند نہیں ہوں"،

اس خیال نے اطمینان کی حالت میں رخنہ ڈالا، اور وہ چند لمحہ کے واسطے تشویش میں پڑ گئی، مگر پھر سنبھلی، اور کہنے لگی،

"تو کیا دنیا میں خوش رہنے کے لیئے، ایک عورت کا حسین ہونا ضروری ہے"،

ہر گز نہیں۔ یہ فیصلہ میرا کام نہیں تھا، ان کا تھا، جنہوں نے، اپنی خواہش پر اصرار کیا اور وہی اس کے ذمہ دار ہیں۔

ہیں دولت مند نہیں ہوں ، مگر کیا عورت کی صفات ہیں ، دولت بھی شامل ہے ،

یقیناً یقیناً اس سے زیادہ کمینہ توقع کسی شوہر کی نہیں ہو سکتی" اب سمیعہ کا چہرہ پھر روشن ہوگیا اور وہ یہ فیصلہ کرتی ہوئی آگے بڑھی۔

"اب مجھ کو بھی اپنے فرائض کی طرف توجہ کرنی چاہیئے" موسم سرد تھا ہوا ٹھنڈی تھی لالان میں آئی تو دیکھا ماں کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور آنسو کے قطرے خاموش رخسار پر بہ رہے ہیں ، بیتاب ہوگئی ، چاہتی تھی ، کہ منہ پر منہ رکھ دے ، مگر دل نے صدا دی۔

"گو ان آنسوؤں کا ہر قطرہ میرے کلیجہ پر ایک بجلی ہے ، مگر اب ان سے میرا تعلق کچھ زیادہ مفید نہیں ،

"ان آنسوؤں کی قدر کرنے والا آرہا ہے"۔

عصمت ۱۹۲۲ء

جگا دھن

جگا دھن، اُن چالاک، اور مکار عورتوں میں سے ایک تھی،
جس کا نام، اس کے بعد بھی "اسلم پور" والوں کی زبان پر آ جاتا تھا، وہ
اپنی کامیابی کے لیئے، نت نئے سوانگ بھرتی، اور نئے نئے کھیل کھیلتی،
اسلم پور کچھ بہت بڑی بستی نہ تھی، مگر ایسا چھوٹا سا گاؤں بھی نہ تھا،
پندرہ بیس ہزار کی آبادی تھی، جن میں چند ہی ایسے خوش نصیب گھر
ہوں گے، جو جگا دھن، کی چالاکی کے شکار نہ ہوئے ہوں، اس کو ہوتی
ہواتی، شادی کے توڑ دینے کا، ایک خاص ملکہ تھا۔ بنے بنائے کام کو بگاڑ
دینے کی عجیب مہارت تھی، اور چلتی چلاتی گاڑی میں روڑا اٹکا دینے
کے، بے مثل ڈھنگ یاد تھے۔ حکیم وہ تھی، ملّانی وہ تھی۔ جن وہ تھی، بھوت
اس پر آتے تھے، جن اس کے تابع تھے۔ چور وہ تھی، مکار وہ تھی،
غرض مشکل ہی سے عیاری کا کوئی فن ایسا ہو گا، جس میں اُسے دخل
نہ ہو۔ جوانی بھر وہ "اسلم پور" کے خاندانوں کا شکار کرتی رہی۔ مگر جب
بڑھاپے کی حدود میں داخل ہوئی، تو "اسلم پور" کا بچہ بچہ اس سے
آشنا تھا۔ اب مشہور ڈاکوؤں کی طرح اس نے آس پاس ہاتھ مارنے
شروع کیئے، وطن کو خیر باد کہا۔ اور پہاڑوں میں رہنے لگی، و

بھیس بدلنے میں یکتا تھی، لسانی، اور طراری میں جواب نہ رکھتی تھی
اور کچھ ایسی باتیں بناتی تھی، کہ ہر شخص کو اُس کا یقین آ جاتا تھا۔

(۲)

سردی کا موسم تھا، پہاڑوں پر برف جم چکی تھی، اور سرحد کے قافلوں
کی آمد و رفت چند روز کے واسطے قطعًا بند ہو چکی تھی۔ کہ جگادھرن کو معلوم
ہوا، کہ ایک دھوم دھام کی شادی، چترال کے قریب سمسوم کے رئیس
کی ہونے والی ہے۔ راستہ دشوار گذار تھا، مسافت بعید، اور موسم
تکلیف دہ، لیکن جگادھرن، کی ہمت کے سامنے، یہ تمام باتیں ہیچ تھیں
وہ کچھ اِس بلا کی عورت تھی، کہ گرمی، اور سردی، آندھی، اور مینہ،
برف، اور پانی کسی چیز کی اس کو پرواہ نہ تھی۔ اس نے بسم اللہ
کہہ کر اپنا بھیس بدلا، اور بڑھیا، پھونس، فقیرنی، اپاہج، لنگڑی، اور
لولی بن کر، روانہ ہوئی۔ ابھی چترال دس بارہ منزل تھا، کہ برف کے
ڈھیر، اور انبار، راستہ میں حائل ہوئے۔ مگر جگادھرن ان تمام
مصیبتوں کو برداشت کرتی رہی۔ اور جس طرح بھی ممکن ہوا، آگے
بڑھتی گئی۔ جنگلی میووں سے، پیٹ بھرا، چشموں کے پانی سے پیاس
بجھائی، مگر ارادہ فسخ نہ کیا، تا آنکہ وہ سمسوم کی حدود میں داخل ہو گئی
دریا بیچ میں تھا، اور برف آسمان سے باتیں کر رہی تھی۔ یہاں سے
گذرنا، آسان کیا، مشکل بھی نہ تھا۔ تین دن تین رات جگادھرن طرح
طرح کے منصوبے، اور تدبیریں سوچتی رہی، مگر عقل نے یاری نہ دی۔
چوتھے روز وہ دوپہر کے وقت شفتالو کے ایک درخت کے نیچے خاموش
بیٹھی تھی، آگ اس کے چاروں طرف روشن تھی، اور سردی کی شدت

نے پریشان کر رکھا تھا کہ اُس نے ایک اوت بلاؤ کو دیکھا کہ وہ اپنے بچوں کو لئے برف کاٹ رہی ہے۔ جگا دھان، سردی کی اذیت کو بھول بھال، اس طرف متوجہ ہوئی، تو کیا دیکھتی ہے کہ اوت بلاؤ جس کے بچے دریا کے اُس پار تھے، برف کو کاٹ کر اندر ہی اندر ایک کھوکھلی سی کھوہ بنا کر ادھر آیا۔ اپنا اور بچوں کا پیٹ بھرا اور واپس چلا گیا، جگا دھان کی تیز طبیعت کو یہ اشارہ بہت کافی تھا۔ اوت بلاؤ کے پار پہونچتے ہی وہ بھی اسی کھوہ میں گھس گئی۔ جان جوکھوں کا کام تھا۔ اگر برف رتی بھر پھسل جاتی یا راستہ بند ہوتا۔ اور ہوا کا گذر نہ ہوتا۔ تو جگا دھان، وہیں ڈھیر تھی۔ مگر اس کی جرأت حیرت انگیز تھی کہ ہتیلی پر سر رکھ کر برف میں گھس گئی۔ لوہے کے دو بڑے بڑے ٹکڑے اس کے ہاتھ میں تھے، اور اگر کہیں کھوہ کی تنگی اُس کے قدم پکڑتی تھی، تو مددگار لوہا آگے کھینچ لیتا تھا۔ اوت بلاؤ کی رہنمائی کامیاب ہوئی، اور ابھی آسمان پر پوری طرح اندھیرا نہ چھایا تھا کہ جگا دھان بھی پار پہنچی، پرند بسیرے کے وقت درختوں پر آئے، آسمان پر تارے دمکے، اور چاند چمکا۔ رات کا سناٹا، ہوا کی تیزی، سردی کی شدت، یہ ایسا منظر تھا کہ اچھے اچھے شجاع کا دل دہل جائے۔ مگر جگا دھان شیرنی نے۔ رات اسی جنگل میں بسر کی، اور صبح کو کیڑوں کی طرح رینگتی ہوئی۔ سمسوم میں داخل ہوئی۔

(۳)
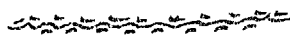
والئے سمسوم کی بیوی خنیسیا، شادی کی تیاریوں میں مصروف ہے دُور دُور سے مہمان جمع ہو رہے ہیں۔ تپت نے زیورات اور کپڑے فراہم

ہو چکے ہیں، اور اذن عام ہے، کہ سمسوم کا ہر فرد بشر ریاست کے دسترخوان سے کھانا کھائے، اکلوتے لڑکے کی شادی ہے، روپیہ ٹھیکری کی طرح خرچ ہو رہا ہے۔ اور غربار کی خاطر مدارات بہت بڑے پیمانہ پر ہو رہی ہے۔ ابھی آفتاب کی طاقت زوال پذیر نہ ہوئی تھی، کہ جگادھرن کی لاش، جس میں سانس موجود تھا، سمسوم کے محل میں داخل ہوئی، امیر سمسوم، اور اُس کی بیگم، جگادھرن کی حالت دیکھ کر تڑپ اُٹھے، بڑھیا بات نہ کر سکتی تھی۔ تھر تھر کانپ رہی تھی، آنکھیں بند تھیں۔ مُنہ، کُھلا ہوا تھا، اور اس کے سوا، کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد گردن پٹخ لیتی تھی، بڑھیا میں کوئی حرکت نہ تھی، مردوں، اور عورتوں کا جم غفیر اس کے گرد جمع ہو گیا، بیگم کے حکم سے، بڑھیا چار عورتوں کے کندھے پر اندر لائی گئی، گرم گرم، چار رحم دل خنیسیا نے اپنے ہاتھ سے پلائی، نرم نرم توشکیں بچھائیں۔ لحاف اُڑھائے، اور اُس کی خدمت کو اپنا فرض سمجھا۔

دوسرے روز شادی تھی، زیور کا صندوقچہ جگادھرن نے محل میں گھستے ہی بھانپ لیا تھا۔ جب رات کا بڑا حصّہ گذر چکا، اور مُردہ جگادھرن کو یقین ہو گیا، کہ مجھ زندہ کے سوا، ہر متنفّس نیند میں مُردہ ہے۔ تو صندوقچہ لے کر باہر نکلی، اور سر پر پاؤں رکھ کر، دریا کی طرف بھاگی۔

(۴)

جب موذن کی اذان نے، نیند کی متوالی خنیسیا، کو جگایا، تو وُہ وضو سے پہلے بڑھیا، کو چار دینے آئی، مگر یہ دیکھ کر سنّاٹے میں رہ گئی، کہ بڑھیا کا کہیں پتہ نہ تھا۔ چاروں طرف دیکھا۔ کونہ کونہ چھان مارا

مگر بُڑھیا کا پتہ نہ ملا، مردوں کو خبر ہوئی۔ بہتیرا ڈھونڈا، اور تلاش کیا مگر بڑھیا ہو تو ملے، ہر شخص حیران، اور سرگردان تھا، مگر یہ معمّہ کسی طرح حل نہ ہوتا تھا۔ کہیں دوپہر کو جاکر وہ بھی، اس لئے کہ کسی زیور کی ضرورت تھی، صندوقچے کی تلاش ہوئی، مگر صندوقچہ کہاں؟ اب آنکھیں کھلیں، اور خیال آیا، کہ بڑھیا بیمار نہیں، ڈاکن تھی، جو سب کی آنکھوں میں خاک جھونک، شادی کا تمام اثاثہ بغل میں لے چمپت ہوئی، تاہم اس خیال سے۔ کہ راستے بند ہیں، نہ صرف زیور کے مل جانے کا پورا یقین تھا، بلکہ جذبۂ انتقام کے پورا ہو جانے کی بھی پوری اُمید تھی۔ لوگ بُڑھیا کی تلاش میں کنار دریا پر روانہ ہوئے، حالت غیظ وغضب میں خود خنیسیا، گھوڑے پر سوار ہوکر چاروں طرف دوڑی اور جب جگا دھران، کہیں نظر نہ آئی، تو اب یہ پورا مجمع کنارِ دریا پر آیا۔

(۵)

سہ پہر کا وقت تھا، خنیسیا، اور اُس کے رفیق، دریا کے اِس طرف تھے، اور جگا دھران، اُس طرف ایک عالیشان درخت پر چڑھی ہوئی پھل توڑ توڑ کر کھا رہی تھی۔ بیچ میں دریا اور برف، حائل تھے، اور تمام مجمع ششدر و متحیر تھا۔ کہ بڑھیا کس راستے سے پار پہونچی۔ بڑھیا نے کھو میں داخل ہوتے ہی پہلی یہ تدبیر کی تھی، کہ برف کا ایک بہت بڑا ٹکڑا کھو کے سرے پر رکھ دیا تھا، تاکہ راستہ کا کسی کو پتہ نہ چلے۔ خنیسیا، اور اس کے رفیق جذبۂ انتقام سے اس قدر متاثر تھے۔ کہ اگر اُن کا بس چلتا۔ تو جگا دھران، کو کچا کھا جاتے، مگر پار جانے کا کوئی راستہ نہ تھا

خنیسیا، جب بالکل نا امید ہو گئی، اور جگادھرن، پیٹ بھر کر اترنے لگی، تو خنیسیا، نے بآواز بلند کہا، دریا کا پاٹ چونکہ کم تھا، اس لئے ہوا کے قہقہوں نے، ان دونوں کے، الفاظ عام کر دیئے۔

خنیسیا "مکار عورت! اگر تیرے پاس ضمیر ہوتا، تو تو سمجھتی کہ تو نے کیا کیا۔ مجھے تیرے دھوکے، یا فریب پر اعتراض نہیں، نہ مجھے اپنے نقصان کا افسوس، یا صدمہ ہے۔ مگر مجھے تجھ سے صرف اتنا کہنا ہے، کہ تو نے اپنی بہنوں کے واسطے نہایت خطرناک بیج بو دیئے، اور ہم کو یقین دلا دیا، کہ حاجتمند عورتیں، مکّار ہوتی ہیں، اب اگر ہم کسی حاجت مند عورت کو اپنے گھر سے جوتیاں مار کر دھکّے، دیدیں تو اس کی ذمہ وار تو ہو گی، اور حقیقی حاجت مند کا، عذاب تیری گردن پر ہو گا۔ او مکّار بڑھیا تو نے اپنی ہم جنسوں کو تباہ، و برباد کر دیا۔ اور سچ مچ کی اپاہج، اور حاجت مندوں کو بھی اس قابل نہ رکھا، کہ امرار کا طبقہ اُن سے ہمدردی کر سکے"۔

جگادھرن "لیکن جائز و ناجائز، کا امتیاز تمہارا کام تھا، میں نے جو کچھ کیا میں اپنے فعل کی ذمہ وار ہوں۔ میں نے حقیقی حاجت مند کو کوئی نقصان نہیں پہونچایا، یہ دینے والے کا کام ہے۔ کہ وہ اطمینان کرے، امتیاز کرے، اور قوم کے حاجت مند۔ اور اپاہج افراد کے کام آئے۔

عصمت۔ ۱۹۲۵ء

بن باپ کا بچّہ

سوتیلی ماں کے مظالم سے، کتابیں اخبار اور رسالے بھرے پڑے ہیں، اور مجھے اِس خیال سے، اتفاق ہے۔ کہ بعض سنگ دل مائیں نہایت بے دردی سے، سوتیلے بچّوں پر ستم توڑتی ہیں، اور ایسے عظیم گناہ کی مرتکب ہوتی ہیں، جس کی سزا اُن کو یقیناً ملے گی۔ وہ آدمی نہیں، جانور ہیں، اور ہرگز یہ حق نہیں رکھتیں، کہ سوسائٹی، ان کو وقعت کی نظر سے دیکھے، لیکن کیا اِس کے ذمہ وار وہ باپ مطلق نہیں ہیں، جو بیوی کی محبّت میں اندھے ہو کر، اپنے بچّے، ایک ظالم عورت کے سپرد کر دیں، اور اس کو اتنا با اختیار کر دیں، کہ وُہ جو جی چاہے کر سکے، علاوہ ازیں قابل مصنّف، اور لائق نامہ نگار جو آئے دن سوتیلی ماؤں کا رونا روتے ہیں۔ کبھی سوتیلے باپوں کی طرف بھی توجہ فرماتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ وجہ یہ کہ قلم درکفِ دشمن است، وہ عورت کی بد انتظامی پر تو صفحے کے صفحے سیاہ کرنے کو موجود ہیں، لیکن خود اپنے نقائص ان کو نہیں دکھائی دیتے۔

میں اور میری سہیلی .... کوئی تین مہینہ کے فرق سے بیاہی گئیں۔ پہلے سال ہم دونو شادی کے بعد تین مرتبہ ملے، مگر جب وہ مرادآباد چلی

گئیں، اور میں بنارس تو چند روز تک خط و کتابت رہی، اور اس کے بعد جیسا کہ دنیا کا قاعدہ ہے - دونو دنیا کے دھندوں میں پھنس گئے ہیں دو ایک مرتبہ لکھنؤ آئی بھی، اور دریافت بھی کیا، مگر سُنا کہ وہ نہیں ہیں، ابکی دفعہ کچھ ایسا جی گھبرایا، اور ملنے کی ہڑک اُٹھی کہ میں کل صبح سیدھی اُٹھ ان کے گھر پہونچی، ان کے والد صاحب نے یہ سُنکر کہ میں ...... سے ملنے آئی ہوں کہاروں کو ایک اور گھر کا پتہ بتایا، جہاں میں جا کر اُتری،

.... بچّہ کو گود میں لئے خاموش بیٹھی تھی، اس کی صورت پہچانی نہ جاتی تھی، مجھے دیکھتے ہی اُچھل پڑی میں گلے ملی، اور حال پوچھا، تو اس نے اپنی داستان اس طرح بیان کی۔

میں اپنی بدنصیبی کا کیا حال بیان کروں، چوتھے سال دو بچّوں کو لیکر رانڈ ہو گئی، مرنے والا خدا اس کو غریق رحمت کرے کہنے کو تو نیچری، اور لامذہب تھا، مگر میں تو کہتی ہوں آدمی نہیں فرشتہ تھا، کہ جب تک جیا میرے قدموں میں آنکھیں بچھائیں اس کے بعد دُنیا میری آنکھوں میں اندھیر تھی، مگر پیاری .... مرنے کے ساتھ کون مرتا ہے - صبر کرنا پڑا - لیکن شوہر کی موت سے بڑی مصیبت مجھ پر ایک اور آئی، اور وہ یہ کہ ابا جان کی عادت، خصلت، مزاج، اور ضد سے تم واقف ہی ہو، وہ ایک قدم بھی مذہب سے باہر رکھنا نہیں چاہتے، اور شاید یہ ہی وجہ ہے سینکڑوں آدمی ان کے معتقد ہیں، اُنھوں نے فوراً ہی میرے دوسرے نکاح کا قصد کیا، اور اپنی ہی مسجد کے ایک طالب علم اور مرید سے نکاح کر دیا......... آج تیرے سامنے کہتی ہوں، میں اِس نکاح سے بھاگ رہی تھی، ڈر رہی تھی، مگر مجبور تھی، مجال نہ تھی، کہ دم مار سکوں، قصہ کوتاہ

دونو معصوم بچّوں کو لے کر مولوی .... کے مکان میں آ پہونچی۔

مولانا جو ابّا جان کے معتقد، مرید، غلام تھے، نکاح ہوتے ہی رنگ لائے، اور تمام تعلقات کو طاق میں رکھ اس پر محلّے لاکر رکھا، اب تین سال میں دو سوکنیں آ چکی ہیں، جو سامنے کے دونو کمروں میں موجود ہیں، .... میرا پیارا بچّہ احسان، میرا بے زبان بچّہ احسان، میری سات برس کی جان احسان، جس نے رات رات بھر میری آنکھوں کے سامنے مولانا کے پاؤں دبائے، اندھیری گلیوں میں دس دس بجے رات کے افیم لاکر دی، ان کو زہر معلوم ہونے لگا، اور میرے یہ کان میدان حشر میں خدا کے روبرو شہادت دیں گے۔ جنہوں نے یہ الفاظ سُنے "مجھ پر اس کا روٹی کپڑا، فرض نہیں، یہ نوکری کرے، اور پیٹ پالے" اس کا کھانا، پینا، رہنا سہنا، چلنا، پھرنا، ہر چیز ان کو ناگوار تھی، اور کھلے خزانے کہتے تھے، کہ پیر صاحب نے دغا سے اپنی بلا میرے سر چپیکی، مجھے خدا نے یہ باتیں سُنوائیں، اور میں نے سُنیں، مارنے میں اُنکو تامّل نہ تھا، گھر کتے میں اُن کو لحاظ نہ تھا، غرض بے تنخواہ کا نوکر ان کے ہاتھ لگ گیا تھا، جس کو کسی قسم کی، اور کسی وقت تعمیل میں عذر نہ تھا، نوبت یہاں تک پہونچی، کہ چار روپیہ مہینہ، اور کھانے پر ایک منشی کے ہاں نوکر رکھوا دیا، یہ اس مظلوم کے پڑھنے لکھنے کے دن تھے، مُنہ اندھیرے اُٹھ کر جاتا۔ اور آٹھ بجے رات کے آتا، دن بھر منشی جی کی خدمت کرتا، رات کو مولانا کی ٹہل، آج پورا ایک مہینہ ہوا رات کے گیارہ بجے تھے مینہ شدّت سے پڑ رہا تھا۔ مولانا نے چار پیسے کا دودھ منگوایا، بچّہ کی ہستی کیا تھی، کہ انکار کرتا گرتا پڑتا گیا۔ اور بھیگتا ہوا دودھ لایا گھر میں

گھستا تھا کہ پاؤں رپٹا اور دودھ سمیت گرا۔ اب مولانا کو تاب کہاں تھی، غصّہ میں آگ ہوگئے اور مارنا شروع کیا۔ اس پر بھی پیٹ نہ بھرا۔ تو گھر سے نکال دیا اور کہا۔

"شریف کی اولاد ہے، تو اب صورت نہ دکھائیو"

میں کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی، مگر دم مارنے کی مجال نہ تھی، ہائے ...... کلیجہ کیونکر کھول کر دکھاؤں! احسان! مجھ سے جدا ہوگیا! آج مہینہ بھر سے میں نے اس کی صورت نہیں دیکھی۔ خدا معلوم کدھر گیا! اس ستم پر دوسرا ظلم یہ ہے۔ کہ اتنی اجازت نہیں کہ اس کا ذکر کرسکوں، یا اس کی یاد میں ایک سانس بھی ٹھنڈا بھرلوں۔

عصمت ستمبر ۱۹۲۰ء

بیوی کا آخری سانس

دنیا مدتوں سے قایم ہے، اور رہے گی۔ لاکھوں، کروڑوں۔ عورتیں پیدا ہوئیں، اور ہوں گی۔ مگر واقعی زندگی اُن ہی کی تھی، جو مرنے کے بعد، اس دنیا میں ایسا نام چھوڑ گئیں، جس کو کبھی فنا نہیں۔ وہ خود مر گئیں، مگر ان کے نام زندہ ہیں، اور رہیں گے۔ وہ اپنی چند روزہ زندگی میں، انسانی زندگی کے، ایسے نمونے پیش کر گئیں، جن پہ عورت ذات کا وجود ہمیشہ فخر کرے گا۔

سلیمہ سلطان، کی حقیقی بھتیجی، اختر سلطان بیگم، جو اکبر، کی پھوپھی زاد بہن، اور اپنے باپ نواب بلند اختر، دیوان ریاست کی اکلوتی بیٹی تھی، جب تمام علوم سے، اچھی طرح فارغ ہو گئی، اور عمر بھی اٹھارہ کے قریب پہونچی، تو باپ کو اس محنتِ جگر کے پیوند کا فکر ہوا۔

اختر سلطان، شکل و صورت کے لحاظ سے بھی یکتا تھی۔ ہزاروں، پیغام آنے شروع ہوئے، اور بالآخر خود ہمایوں، نے اِس آسمانی حور کا عقد داروغہ محمد زمان شاہ، کے لڑکے، بلند افروز سے کر دیا۔ جو فوج کا سب سے بڑا سردار تھا، و دفعتہً سلطنت میں

زبردست انقلاب ہوا، شیر شاہ نے ایک آفت برپا کردی۔ اور اختر سلطان بیگم، کو ماں باپ کے ساتھ کابل جانا پڑا۔ فوج کے بڑے بڑے سردار کام آچکے تھے۔ اور گو بیگم، کو اپنی بیوگی کا یقین تھا مگر اس کا دل چاہتا تھا۔ کہ وہ ایک دفعہ شوہر کی قبر پر بیوگی کے آنسو گرائے۔ ادھر بلند افروز، اپنا حلیہ بدل کر پہاڑوں۔ اور جنگلوں میں چھپا پھرتا تھا، خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے۔ کہ بیگم کے ماں باپ دونو کابل میں انتقال کر گئے، اور اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ کہ شوہر کا حال دریافت کرے۔ چنانچہ مردانہ بھیس بدل کر ایک گھوڑے پر سوار ہوئی، اور بسم اللہ کہہ کر ہندوستان کا رُخ کیا۔ موسم سرد تھا، اور رستے برف سے پٹے پڑے تھے۔ چند منزل چل کر گھوڑے نے جواب دیا۔ اور کشمیر کے قریب پہونچ کر وہ رفیق بھی بیگم پر نثار ہو گیا۔ جنگل کے پھل کھاتی چشموں کے پانی پیتی، یہ نازوں کی پالی بیگم اس طرح منزلیں طے کر رہی تھی۔ اس کے نازک پاؤں لہولہان ہو گئے تھے۔ ایک رات کا ذکر ہے۔ کہ اس نے "ہریانے گاؤں میں آگ جلتی دیکھی، متواتر فاقوں نے بے قابو کر دیا تھا، اور سردی کی شدّت سے رستہ چلنا دوبھر تھا۔ مگر اس خیال سے کہ یہاں کچھ پناہ ملے گی گرتی پڑتی قریب پہونچی۔ دیکھتی کیا ہے، کہ ایک شخص، جو بظاہر کوئی گنوار معلوم ہوتا تھا۔ بہت سی لکڑیاں سُلگائے بیٹھا ہے۔ سلام کیا۔ اور آگ کے پاس بیٹھ گئی......جب حرارت نے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھ پاؤں میں کچھ جان ڈال دی، تو دونوں میں باتیں ہونی شروع ہوئیں۔ گنوار دیکھنے میں تو نہایت سخت مزاج معلوم ہوتا تھا۔ مگر یہ سُنکر۔ کہ

مہمان کی جان بھوک کے مارے لبوں پر ہے۔ اُٹھا اور ایک جھولی میں سے موٹی موٹی دو روٹیاں نکال کر آگے رکھیں۔ بیگم کو اس وقت یہ نذر نعمت غیر مترقبہ تھی۔ روٹی کھائی۔ پانی پیا، اور میزبان کا شکریہ ادا کرنے لگی۔

یہ گنوار درحقیقت بیگم کا شوہر تھا۔ مگر عجیب اتفاق تھا، کہ اس حالت میں پہونچا، کہ پہچان نہ سکا۔ البتہ اتنا تو دریافت کیا، کہ "کیا تم خاندان شاہی سے تعلق رکھتی ہو؟"

مگر صاف جواب پاکر وہ خاموش ہو گیا۔ بیگم، اتنا سنتے ہی اُٹھ کھڑی ہوئی، اور ایک طرف کا رُخ کیا۔ بلند افروز کو شبہ تو ہو ہی گیا تھا آنکھ بچاکر اپنے مہمان کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا، ابھی آسمان تاروں سے پٹا پڑا تھا، کہ سڑک پر دو آدمیوں نے بیگم کو روکا، اور قریب کے باغ میں زبردستی لے گئے۔ افروز بھی آنکھ بچاکر باغ میں داخل ہوا ایک درخت کی آڑ میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ صبح ہو چکی تھی، اور ظالم لٹیرے مسافر عورت کو پہچان کر سختی سے پیش آرہے تھے، ایک نہایت غصہ کی حالت جھپٹا، اُس وقت بیگم کا خنجر آبدار چمکا، اور اس ظالم کی لاش خون میں تڑپنے لگی، دوسرا ساتھی یہ رنگ دیکھ کر بے قابو ہو گیا۔ تلوار لے کر آگے بڑھا، ادھر بیگم نے سنگ دل کا وار ہاتوں پر روکا۔ ادھر بلند افروز نے، ایک ہی وار میں اس کی گردن اُڑا دی، مگر بیگم بیہوش ہو چکی تھی۔ افروز نے اپنی بیوی کو ہاتھوں میں لیا، اور چلتا ہوا۔ دوپہر کے وقت جب ایک درخت کے نیچے عصمت کی اس دیوی نے آنکھ کھولی تو سر شوہر کے ہاتوں پر تھا۔ اس تکلیف، اور بیچینی کی حالت

میں سر زمین پر رکھ دیا۔ اور بہ منت کہا۔

"تم میرے محسن ہو میں عورت ہوں، میرے جسم کو ہاتھ نہ لگاؤ"

بلند افروز پہلے ہی یقین کر چکا تھا۔ مگر انجان بن کر پوچھا۔

"تم کس خاندان کی عورت ہو، اور کہاں جانا ہے"

بیگم کو اپنی حالت سے مایوسی تھی، اس نے مفصل کیفیت بیان کردی، اور اس قدر التجا کی کہ "میرے بعد اگر میرا شوہر بلند افروز زندہ ہو تو میری خبر موت اس تک پہونچا دینا"

اتنا سنتے ہی بلند افروز کی ہچکی بندھ گئی، اور کہا۔

"بیگم، وہ بدنصیب شوہر جس کی تلاش میں تم پر یہ تمام مصیبت پڑی میں ہی ہوں"

زخموں نے اتنا نڈھال کر دیا تھا کہ اب بیگم کچھ جواب نہ دے سکی شوہر نے عصمت کی دیوی کا سر گود میں رکھا اور اسی حالت میں یہ بیگم۔ اس دنیا سے سدھار گئی۔

عصمت۔ ۱۹۱۵ء

سیدانی کی وفاداری

اگر تاریخ کا سلسلہ دنیا میں موجود نہ ہوتا، جس کے ذریعہ سے سینکڑوں برس کے حالات ہم کو معلوم ہو رہے ہیں۔ تو بھی اُن پاک روحوں کے کارنامے جو دنیا میں بے لوث آئیں، اور نیک نام گئیں، دُنیا فراموش نہ کر سکتی تھی۔ خود انسانی زندگی، اُن متبرک، اور مقدس روحوں کے اعمالوں کو سروں پر رکھتی، اور سینہ بہ سینہ اس وقت تک دوسروں کو پہنچاتی، جب تک ناپائدار دنیا ختم نہ ہو جائے۔ بہر حال ہم تاریخ کے شکر گذار ہیں، کہ اس نے ہم تک ہزاروں برس کے واقعات پہنچا دیے۔

مرد شجاعت، لیاقت، اور قابلیت کے اعتبار سے پردۂ دُنیا پر بے نظیر نظر آ رہا ہے۔ مگر افسوس ہے وفاداری میں اس کا نام بہت کم نظر آتا ہے ہاں البتہ اس اعتبار سے عورت مرد سے بازی لے گئی ہے

۱۵۹۵ء میں جب اکبر کے زمانے میں اس کے بیٹے مراد نے۔ احمد نگر پر حملہ کیا۔ اور چاند بی بی اپنے بھتیجے نظام شاہ کی سلطنت کو

بچانے کے واسطے میدان میں آئی ہے۔ تو سلطنت "بیجا نگر" کے قریب
ایک چھوٹی سی ریاست "پالم پور" کے نام سے مشہور تھی جس کی باگ
سیدانی سلطانہ کے ہاتھ میں تھی۔ یہ اس لیے نہیں کہ وہ نظام
شاہ کی باج گذار تھی۔ بلکہ اس لیے کہ وہ چاند بی بی کی سہیلی تھی۔
اور دونوں کا بچپن ساتھ بسر ہوا تھا۔ حملہ کی خبر سنتے ہی احمد نگر کی طرف
روانہ ہوئی۔ اس کا شوہر رانا ہر چند مانع ہوا مگر سلطانہ
نے اس کی رائے پر مطلق دھیان نہیں دیا اور رانا کو ساتھ لے کر
آگے بڑھی۔

خاندیس کا راجہ شہزادہ مراد سے مل چکا تھا۔ اور شاہی فوج
فصیل میں سرنگ لگا چکی تھی۔ اگر چاند بی بی تلوار لے کر سرنگ کے
دروازہ پر نہ کھڑی ہوتی تو قلعہ یقیناً فتح ہو جاتا۔ اس معرکہ میں۔ کہ
سلطانہ چاند بی بی کے ساتھ قلعہ کو بچا رہی تھی، شہزادہ اپنے
حملے میں تو ناکام ہوا مگر سلطانہ کی طرف سے اس کے دل میں
زبردست کینہ بیٹھ گیا اور اس نے عہد کر لیا کہ جب تک
سلطانہ سے اس کا بدلہ نہ لوں گا اطمینان سے نہ بیٹھوں گا۔
چنانچہ دوسرے سال زبردست فوج لے کر آیا۔ سلطانہ اپنے
دشمن سے غافل نہ تھی۔ سہیلی کی مدد کو فوراً پہنچی۔ اور دونوں لشکر
گوداوری کے کنارہ پر آپڑے۔ کامیابی تو اس معرکہ میں مراد
کو نصیب نہ ہوئی مگر سلطانہ کی بدنصیبی سے رانا زندہ پکڑا گیا۔ یہ
خبر سنتے ہی بہادر اور عصمت کی دیوی رانی سلطانہ کے ہوش و
حواس جاتے رہے۔ وفا کی یہ تصویر اسی طرح ہتھیار لگائے دشمن کے

خیمہ میں پہنچی، اور شہزادہ مراد کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔
مراد، سلطانہ کا جانی دشمن تو پہلے ہی سے تھا، اس وقت اس کو
تنہا اپنے قبضہ میں پاکر چاہتا تھا کہ قتل کا حکم دے۔ مگر خود مراد
کی طبیعت نے اس کی زبان روکی، اور وہ غور کرنے لگا کہ گو رانی
سلطانہ، میری دشمن ہے۔ مگر اس کی جرأت ضرور قابل تعریف
ہے، کہ عورت ہوکر اپنی جان پر کھیل گئی، اور میرے سامنے آ کھڑی
ہوئی۔ دفعتاً سلطانہ، آگے بڑھی۔ اور کہا آج کے معرکہ میں میرا
بہادر شوہر رانا تمہارے قبضہ میں آ گیا ہے تم کو معلوم ہے۔ کہ میں سادات
کی لڑکی ہوں، میری رگوں میں وہ خون لہریں لے رہا ہے۔ جس کا
لوہا تمام ہندوستان مانتا ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں تمہارا اس
سرزمین میں کامیاب ہونا ناممکن ہے، مگر میری تمام ہمت میرے
شوہر تک تھی، آج وہ تمہارے قید میں ہے، تم نے رانا کو نہیں قید کیا
بلکہ سلطانہ کی کمر توڑ دی۔ شہزادے لڑائی کا لطف دیکھنا ہے۔ اور
عورت کی بہادری آزمانی ہے۔ تو رانا کو چھوڑ دے۔ اس کے برابر زر و
جواہر تول دیتی ہوں“

لالچ سے مراد کے منہ میں پانی بھر آیا مگر مدتوں کی آگ دشمن کی
صورت دیکھ کر، اور بھی بھڑکی۔ طیش میں آکر کہا ”رانا کی رہائی ناممکن ہے“
مراد، نے یہ کہہ کر حکم دیا۔ کہ ”رانا کو حاضر کرو“ گرفتار رانا حاضر کیا
گیا۔ مشکیں کسی ہوئیں تھیں، اور زبردست بیڑیاں پاؤں میں، شوہر کی
صورت دیکھ کر سلطانہ، بے تاب ہو گئی۔ دوڑ کر قدموں پر گری، اور
باواز بلند کہا۔

"۔۔۔ سرتاج وہ جرأت اور شجاعت آپ ہی کی بدولت تھی۔
اب میری زندگی وبال ہے۔ اپنے ہاتھ سے میرا کام تمام
کیجئے۔ کہ میں نجات ابدی حاصل کروں۔"
مراد یہ حالت دیکھ کر آگ بگولہ ہوگیا۔ اور حکم دیا:۔
"رانا کا سر تن سے جدا کردو"
حکم کی دیر تھی۔ رانا کا سر تن سے جُدا کر دیا گیا، مگر اب شہزادے نے
ادھر مڑ کر دیکھا، تو سلطانہ، اپنے سینہ میں خنجر گھونپ چکی تھی! یہ دونوں
لاشیں زمین پر تڑپیں۔ اور چند لمحہ میں ختم ہوگئیں۔

عصمت، ۱۹۱۵ء

ظہیرۃ السّلطان، پڑھی لکھی ہوتی، تو ہم کو بھی صبر آتا، مگر اس کم بخت نے تو اپنے ساتھ تعلیم نسواں کو بھی ڈبویا۔ معمولی مشاہدہ بھی تو نہیں، لڑکیوں میں خاصی اچھی مقرّرہ تھی۔ اسلامیہ کالج کی زنانہ شاخ میں اس کا لیکچر آج تک کہ بارہ برس سے زیادہ گذر گئے۔ معروف و مشہور ہے، یہ جو کچھ تھوڑا بہت چرچا سادات نصیر پور میں ہوا، اسی کی بدولت ورنہ نصیری سیّد تو تعلیم نسواں کے نام سے شیطان کی طرح بھاگتے تھے نہ یہ کہ ان کی بہو بیٹیاں، خود ایک مدرسہ قائم کریں۔ جس سے ایک دو نہیں بیسیوں لڑکیاں عالم و فاضل بن کر نکلیں۔

ہم ظہیرۃ السّلطان، کی زندگی کے اس حصّہ کو بہت کچھ تعریف کے قابل سمجھتے، اور حق یہ ہے۔ کہ وہ اس کی مستحق تھی، اس نے اپنے شوق پر سب کچھ قربان کر دیا۔ جو دُھن شروع میں سمائی تھی اس میں رہی، اور اسی میں مری، مگر اس کی ابتدائی زندگی پر ایک ایسا بدنما دھبّہ نظر آ رہا ہے، کہ یہ دن رات کی خدمات بھی اس کو صاف نہیں کر سکتیں۔

دُور اندیشی و انکساری کے ساتھ نخوت اور ضد کا مادّہ بچپن ہی سے اس کے مزاج میں موجود تھا، وقت گزرتا گیا اور علاج ہو نہ سکا نتیجہ ظاہر تھا عمر کے ساتھ ہی ساتھ ضدیں اور ہٹیں۔ ترقی کرتی گئیں اور کوار پنے ہی میں یہاں تک نوبت پہونچ گئی تھی، کہ ذرا کوئی بات مرضی کے خلاف ہوئی، اور اس نے کوٹھری میں گھس جو اندر سے کنڈی لگائی تو اب سارے گھر نے قدری کر ڈالی، مگر وہ اللہ کی بندی ٹس سے مس نہیں۔ ایک دفعہ تو پوری رات اور آدھا دن اسی طرح ہو گیا۔ مجبوراً لوہارسے کواڑ اترانے پڑے۔ یہ عیوب میکے ہی میں میل کا بیل اور تل کا پہاڑ بن چکے تھے۔ سسرال پہونچیں، تو نزاکت کا یہ حال تھا، کہ دو پہر سے دوپہر پورے چوبیس ۲۴ گھنٹے ہو گئے، اپنے اپنے طور پر سب ہی نے سمجھایا، مگر اس اللہ کی بندی نے نوالہ نہ توڑا۔

ساس نندیں کچھ روز تک تو للّو پتّو کرتی رہیں، مگر ماہنیں نہ تھیں کہ کرتیں، اور نہ اُکتاتیں۔ جل جلا الگ ہو گئیں، گھنٹوں کیا بلکہ دنوں بھی کوئی آکر جھانکتا تک نہ تھا، سامنے کے دالان میں سب بیٹھے ٹھٹھے مارتے، اور نخرے بیٹی بہو اکیلی پڑی سڑتی۔

شادی کو مشکل سے تین مہینے گزرے ہوں گے ظہیرۃ السلطان نے میکہ جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ شوہر دیس میں تھا، اور صبح شام آنے کی خبر تھی، ساس نے آکر کہا "بیٹی میں تمہارے جانے کو منع نہیں کرتی مگر تم خود سوچ لو روز آنے آنے کی ہو رہی ہے۔ خبر نہیں آدھی پچھلے کس وقت آ اُترے، ان ہی باتوں سے دلوں میں فرق پڑتا ہے۔ کوئی ضروری کام تو ہے نہیں، دو تین روز کے بعد چلی جانا"

ساس بچاری سیدھے سبھاؤ سمجھا بجھا چلدیں۔ مگر ضدن بہو کہیا ماننے والی تھی کچھ دیر تک تو کمرے میں بیٹھی ہنہ نئی ہنکارتی رہی۔ اور پھر ماما سے ڈولی منگوائی منگوا کیسا ملنا جلنا۔ اور کہاں کا سلام آداب۔ ساس منہ تکتی رہیں۔ اور وہ میکے چلتی ہوئی۔

خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے۔ ادھر بیوی میکے پہنچیں۔ اودھر شوہر پردیس سے آئے۔ چاروں طرف دیکھ بھال اماں سے پوچھا بہو کہاں ہیں۔ وہ بچاری کیا جواب دیتیں پہلے تو چپکی رہیں۔ جب زیادہ دیکھ بھال ہوئی تو کہنے لگیں میکے گئی ہیں۔ کل آجائیں گی۔ دولہا میاں کو تو کپڑے اتارنے بھی قسم تھے۔ ہاتھ دھویا نہ منہ۔ پان کھایا نہ بیٹھے سسرال جا داخل ہوئے۔ میاں کی صورت دیکھتے ہی۔ بیوی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اور کہا خدا کی قسم میں تو تم سے نہ کہتی۔ مگر میری ماما کے سامنے اماں جان نے مجھے زبردستی گھر سے نکالا ہے۔

رات جوں توں گذری صبح میاں نے بیوی سے سسرال چلنے کے واسطے کہا۔ ظہیرۃ السلطان۔ اپنے نام کی ایک تھی ہرچند اس بیچارے نے خوشامد کی مگر اس مکار نے جنبش نہ کی۔ اکیلا ماں کے پاس آیا وہ ظہر کی نماز پڑھ رہی تھیں کچھ دیر تک کھڑا بڑبڑاتا رہا۔ جب وہ سلام پھیر چکیں۔ تو دل کھول کر بھڑاس نکالی بیچاری اگلے زمانہ کی عورت بیٹے کے منہ کیا لگتیں۔ سچا سچا حال بھی تو نہ کہا گیا اور بہو کا الزام اپنے اوپر تھپوالیا۔

صاحبزادہ بیچ چلا کر رخصت ہوئے۔ بیوی کی بے گناہی ماں

کے ظلم کا پورا پورا یقین ہوگیا۔ اور اس دن کے بعد سے ماں کے گھر پر آکر جھانکنا تک قسم ہوا۔

دو سال سے اوپر یہ دونوں میاں بیوی۔ اس طرح رہے کہ بدنصیب ماں بیٹے بہو کی صورت کو ترستی رہی۔ جب شفقت مادری زیادہ جوش میں آئی۔ تو ایک روز شام کے وقت ڈولی میں بیٹھ بیٹے کی صورت دیکھنے ہوکے گھر پر آئیں۔ آفتاب۔ غروب ہوچکا تھا، مگر اندھیری گھپ رات نے چاروں طرف سناٹا کردیا تھا۔ گھر میں گھسیں۔ تو دونوں میاں بیوی شطرنج کھیل رہے تھے بیتاب ہوکر دوڑیں، اور بیٹے کے سینہ سے لپٹ گئیں۔ ناہنجار لڑکا صورت دیکھ کر یہ کہتا ہوا کھڑا ہوگیا۔

"مجھے آپ سے کچھ شکایت نہیں۔ بیگم صاحب کو ہے اُن سے معافی مانگئے" بھلا وہ غریب معافی اور معذرت کو کیا جانیں، چپکی کھڑی ہوگئیں اور دونوں کمبختوں میں سے کسی نے بیٹھنے کو نہ کہا۔ ڈولی دروازہ پر کھڑی تھی۔ الٹے پاؤں گھر آگئیں، عمر کا تقاضہ، بڑھاپے کے دن اس پر یہ زبردست دھکا، تین یا چار روز کے بعد خدا کے یہاں سدھاریں!

زمانہ کسی کروٹ پر چلے، اور دنیا کے ڈھنگ کیسے ہی بدل جائیں مگر سچ، اور جھوٹ کو پرکھنے والی انسانی زندگی جب تک موجود ہے، سچ کا بول بالا رہے گا۔ ڈھائی تین سال اور اسی طرح ختم ہوئے، اور اب وہ وقت آیا، کہ خود واقعات نے ماں کی بے گناہی کا بدنصیب بیٹے کو یقین دلا دیا، مگر اب کیا ہوسکتا تھا، جو ہونا تھا ہو چکا میاں بیوی

دلوں میں فرق پڑ گئے۔ اور عمر کا باقی حصہ نہایت ہی ذلت سے بسر ہوا۔

شوہر کے بعد ظہیرۃ السلطان نے جو کچھ قومی خدمت کی وہ قابل تحسین ہے۔ مگر خود اس کو جب اپنی اس حرکت کا خیال آتا تھا، تو پشیمان ہو جاتی تھی۔

زیادہ تر افسوس اس کا ہے۔ کہ ساس موجود نہ تھیں۔ جن سے قصور معاف کروا لیتی۔ بہرحال ہماری دعا ہے۔ کہ خدا۔ اس کا قصور معاف کرے، مگر امید نہیں، کہ منصف حقیقی ایک بہو کے ایسے ظلم کی سزا نہ دے۔ شاید ساس کے شفقت بھرے آنسو دوزخ کی آگ کو سرد کر دیں، تو کر دیں۔

عصمت سنہ ۱۹۱۵ء

موئی مٹی کی نشانی

رات، مہمانوں کو کھانا دیتے دلاتے، برادری کے حصے بانٹتے بونٹتے، دو تو
یوں ہی بج گئے تھے۔ ذرا فرصت ہوئی تھی، کہ ڈومنیوں نے گانا شروع کیا۔
گھنٹہ پون گھنٹہ وہاں بیٹھنا پڑا۔ میں رات بھر کی جاگی، دن بھر کی تھکی ہاری،
گانا کیا سن رہی تھی، بیٹھی جھوم رہی تھی۔ آنکھیں تھیں کہ میچی جاتی تھیں۔
دنیا طرح سمجھتی تھی، کہ اگر میں اٹھی تو یہ سارا سماں ہی درہم برہم ہو جائیگا،
اول تو یہ نکچڑیاں، اٹھنے ہی کب دیں گی، اور اگر چوری چھپے، آنکھ بچا بچو،
چل بھی دی، تو سب منہ آئیں گے۔ گانا ختم ہوگا۔ اور میری ڈھنڈ یا
پڑ جائے گی۔ شرمندگی ہوگی سو الگ کہ اچھی گھر والی تھیں۔ خدا خدا کرکے
تو یہ دن آیا کہ بچے کا دودھ چھٹا۔ شادی رچانی نصیب ہوئی۔ اور آپ
مہمانوں کو چھوڑ، چمپت ہوئیں۔ ڈومنیوں پر یہ شامت سوار ہوئی کہ رات
بھر پہیلیاں چھیڑتیں، دن بھر یوں گلا پھاڑتی رہیں۔ دو گھنٹے اب چلائیں۔
آوازیں پڑ گئیں، گلے بیٹھ گئے، مگر بس نہیں۔ جب چار بج گئے۔ اور میں نے
دیکھا کہ یہ بیویاں تو کسی عنوان اٹھنے کا نام نہیں لیتیں اور میرا مغز ہے
کہ پھٹا جا رہا ہے۔ تو مجبور میں نے خود ہی منہ پھوڑ کر ڈومنیوں سے کہا اب
بس کرو بُوا

اُن کا خاموش ہونا تھا کہ سیدھی اُٹھ سونے کے کمرے میں، پلنگ
تک تو خیر میں نیند میں چکراتی ہوئی پہنچی۔ اور بچھونوں پر لیٹ بھی گئی۔ مگر
چادر جوڑا اُٹھا کر اوڑھنا تھا کہ ایک اور ہی تصویر میری آنکھ کے آگے
پھر گئی۔ گو میں نے یہ انتظام خاص طور پر کر لیا تھا کہ مری ہوئی بہن نعیمہ یعنی
سوکن کی کوئی چیز گھر میں نہ رہنے پائے۔ جہیز صندوقوں میں سینت دیا۔
برتن کوٹھریوں میں رکھ دیئے۔ چھوٹی موٹی چیزیں اللہ کے نام دے دیں۔
مگر ڈھائی پونے تین سو کا کارچوبی دوشالہ ایک دفعہ کا اوڑھا ہوا تھا کا
نیا نہ رکھنے کو جی چاہا نہ اللہ کے نام دینے کی ہمت پڑی۔ آج ہی ٹرنک سے نکال
پلنگ پر ڈال دیا تھا۔ اس وقت اوڑھنے کو تو اوڑھ لیا اور تنہ لپیٹنے کو لپیٹ
لیا۔ مگر ساتھ ہی خیال آیا کہ جس چیز نے اپنے مالک سے وفا نہ کی وہ مجھ سے
کیا کرے گی نعیمہ بہن نے کس چاؤ ارمان سے خریدا ہوگا۔ چیز ویسی کی
ویسی ہی موجود ہے۔ مگر چیز والی کی ہڈیاں بھی گل کر خاک ہو گئیں۔ اتنا خیال
آتے ہی نعیمہ کی صورت سامنے تھی ہم دونوں کا بچپن میں اچھلنا کودنا۔ اُٹھنا
بیٹھنا۔ لڑنا جھگڑنا۔ اماں جان کا دق ہونا۔ ابا جان کا سمجھانا۔ غرض ایک جھکڑ
بندھ گیا۔ اللہ بخشے۔ نعیمہ گو مجھ سے سوا ہی برس بڑی تھی۔ مگر ایسی بہن پر
سے سو مائیں قربان کیں۔ ذرا میرے پھانس لگتی تھی تو بے چین ہو جاتی تھی
سسرال پہنچکر بھی گو وہ مجھ سے کوس ڈیڑھ کوس کے فاصلہ پر تھی۔ مگر جہاں
کوئی اچھی چیز پکی۔ اور اس نے آدمی دوڑایا۔ حمید اتنا پیارا تھا۔ مگر اُس
تک کو میرے واسطے۔ گھرک جھڑک دیتی تھی۔

میں اس ادھیڑبن میں تھی کہ پانچ بجے۔ گھنٹے کی آواز سن کر میں نے
کروٹ لی کروٹ لیتے ہی ذرا آنکھ لگی دیکھتی کیا ہوں کہ نعیمہ سفید براق

کپڑے پہنے ایک گلاب کا پھول ہاتھ میں لیئے میرے سامنے کھڑی ہے۔ اور میں مسہری کے پاس ایک آرام کرسی پر بیٹھی سعیدا کو پیار کر رہی ہوں۔ نعیمہ میرے قریب آئی گلے ملی۔ دعا دی۔ بچے کو لے کر پیار کیا۔ اور مجھ سے کہا۔ فہیمہ! پیاری تیرے لال کی ہزاری عمر! الٰہی تیرے کپڑے بسیں! تو اپنے چاند کی بہار دیکھے! آج کی شادی میں بڑے بڑے تحفے اور قیمتی چیزیں تیرے ہاں آئی ہیں۔ اگر قبول کر۔ تو مری ہوئی بہن کی طرف سے یہ گلاب کا پھول ہے۔ خدا تجھے ایسا ہی جیتا جاگتا پھول سا بیٹا اور دے۔ خفا نہ ہو تو کچھ کہوں۔ اور غور سے سن تو اپنی کہانی بھی سناؤں۔ یہ خاطر جمع رکھیو کہ تیرے رتبہ اور تیری عزو وقعت کا لحاظ رکھوں گی۔

میں جانتی ہوں کہ آج خدا نے تجھ کو ہر قسم کا عروج دیا ہے۔ تو ایک معزز رئیس کی بیوی اور ایک تعلقہ کی مالک ہے۔ میں تیرے سامنے بہن ہونے کی حیثیت سے نہیں، ایک بے ماں کے بچے کی طرف سے کچھ عرض کرنے آئی ہوں۔ خدا تیرا سہاگ رہتی دنیا تک رکھے۔ تو دودھوں نہائے پوتوں پھلے۔ تیری ترقی دن دونی رات چوگنی۔ مگر اے دنیا کے عارضی جلووں پر متوالی بیگم۔ ذرا میرے ساتھ باہر نکل کر دیکھ۔ دیکھ چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ تارے کھلے ہوئے ہیں۔ باغ مہک رہا ہے۔ بارہ دری میں غور کر کیسی عیش و بہار کی محفل جمی ہوئی ہے۔ فہیمہ! اس خاتون کو پہچان جو پھولوں میں بیٹھی تک رہی ہے۔ مامائیں۔ اصیلیں اس کے آگے دست بستہ کھڑی ہیں۔ اور اس محفل کا سرتاج اس کے آگے آنکھیں بچھا رہا ہے بیگم! ادھر دیکھ چاند رخصت ہوا۔ تارے ختم ہوئے محفل برہم ہوئی اور اس زر و جواہر والی کا فقط نام ہی نام باقی ہے۔ جس کی فقط تصویر

رہ گئی۔ اِس تصویر کو اُٹھا اور غور کر یہ کون ہے۔ فہیمہ بیگم ایہ میں ہی بدنصیب ہوں، جو آج اپنے بدنصیب لال کی تجھ سے سفارش کرنے آئی ہوں۔

اختیار والی بیگم! دولت جیسی بے وفا چیز۔ عمر جیسی چند روزہ مہمان پر اتنا بھروسہ نہ کر، کہ کبھی افسوس کرنا پڑے۔ غنیمت سمجھ جو وقت گزر رہا ہے، اور نعمت جان جو حالت بدستور ہے۔ آنکھ بند ہوتے اور حالت بدلتے کچھ عرصہ نہیں لگتا۔ بڑے بڑے کڑیل جوان آناً فاناً، دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اور آج اگر باقی ہیں تو صرف اُن کے کام محل، دو محلوں کی رہنے والیاں پل مارتے میں جھونپڑے کو محتاج ہوگئیں۔ اور اب اگر کچھ رہ گیا تو اُن کے گُن۔ دنیا کو۔ فانی حالت کو۔ عارضی عروج کو چند روزہ سمجھ کر زندگی بسر کر۔

کل رات تیرے دسترخوان سے پونے سات من بریانی ستنجن تقسیم ہوا، مگر قسمت میں دو دانے نہ تھے۔ تو تیرے حقیقی بھانجے، مری ہوئی بہن نعیمہ کے بیٹے، میرے اللہ آمین کے لال، سعید کے سوتیلے بھائی حمید کے!! جو گیارہ بجے تک راہ تک تک کر دالان کے کونے میں پڑ کر سو گیا۔ فہیمہ پیاری، امتا، ممتا سب کی برابر ہے۔ کالے کلوٹے، میلے کچیلے، بچّے جن کو دیکھ کر گھن آتی ہے۔ اور جی متلاتا ہے۔ یہ بھی کلیجوں کے لال ہیں۔ انسانیت کے معنی یہ نہیں، کہ اپنا پُوت، اور دوسرے کا ڈھینگرا صاحبِ اولاد ہو کر ممتا کی قدر نہ کی، تو عورت نہیں حیوان ہے۔ سوچ، خود ہی سوچ۔ اگر سعید، اِس طرح بھوکا سو جاتا تو دل پر کیا گزرتی۔ اے نادان! بہن کے پیٹ، اور اپنے پیٹ میں اتنا فرق؟ فہیمہ، سعید، تیرے پاس ہمیشہ رہنے والا نہیں۔ اور چند روز کی تکلیف ہے۔ اس وقت کی قدر کر۔ اور اس مہمان کو کلیجے سے لگا۔ یہ تیری دنیا، اور دین دونوں کو سنوار دے گا۔

اس کے سر پہ ہاتھ پھیر۔ اس کا دل ہاتھ میں لے۔ دنیا تیری تعریف کرے گی
عاقبت میں بیڑا پار ہو گا۔ مامتا کا جوش جس وقت مجھ کو بے چین کرتا ہے
اور سعیدہ کو کلیجہ سے لگاتی ہے۔ اس وقت کو یاد کر اور پھر سوچ کہ مامتا کیا چیز
ہے۔ فہمیدہ! جس وقت حمیدہ حسرت و یاس سے تیرا منہ تکتا ہے۔ اور اس کا
ننھا سا دل وہ دل جس کا کنول بجھ گیا۔ تیری شفقت کا امیدوار ہوتا ہے۔
اس وقت کی قدر میرے دل سے پوچھ۔ پیاری فہمیدہ! وہ کام کر کہ دنیا میں نام
ہو جائے۔ میٹھی زبان سے اس مرجھائے ہوئے پھول کو تر و تازہ کر۔ اس
ٹوٹے ہوئے دل کو تو تھوڑی سی محبت بھی نعمت ہو گی۔ فہمیدہ! انسانیت کا
جامہ پہنا ہے، تو اس کو نبھا۔ دکھے ہوئے دل کی آہ بری چیز ہوتی ہے۔ میری
اس وقت کی بات یاد رکھیو۔ بیکس دلوں کو خوش کرنا دونوں جہان کی
نعمت ہے"

اتنا کہہ کر نعیمہ رخصت ہوئی۔ اس کا آنکھ سے اوجھل ہونا تھا کہ میری آنکھ
کھلی۔ خدا گواہ ہے۔ اگر میں نے کبھی حمیدہ کو انگلی بھی لگائی ہو۔ یا خفا ہوئی ہوں۔
ہاں اتنا ضرور تھا۔ کہ جو محبت مجھ کو نعیمہ کی زندگی میں اس سے تھی اس میں
زمین آسمان کا فرق تھا، مگر میرا خدا دیکھتا ہے۔ اگر میں نے اس کی طرف
سے کبھی کوئی جھوٹی بات اس کے باپ کو لگائی ہو۔ ہاں اس میں شک نہیں
کہ میں اس سے بات بہت کم کرتی تھی، اور جس وقت یہ خیال آتا تھا
کہ جائداد کا مالک یہ ہو گا، تو مجھے نفرت ہو جاتی تھی۔ پھر بھی یہ کبھی نہیں ہوا
کہ میں نے اس کو بھوکا رکھا ہو۔ رات کو البتہ مجھے اس کا خیال بالکل نہ رہا۔
اس وقت نعیمہ کو خواب میں دیکھنا تھا۔ کہ دل بے قابو ہو گیا۔ اس کی محبت
بھری دعائیں، پھول کا دینا، اس کے عروج و زوال کی تصویر، اس کی عاجزی

اور منّت، سچی باتیں۔ اور اچھی نصیحتیں۔ حمیدہ کی حمایت۔ سعید کی محبت۔
غرض ان تمام باتوں نے مل کر مجھ کو بے اختیار کر دیا۔ ہر چند سنبھالتی تھی
مگر دل تھا کہ اُمڈا چلا آتا تھا۔ خوب پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ جب دیکھا کہ
کسی طرح تسکین نہیں ہوتی تو اُٹھی آنسو پونچھے باہر آئی۔ دیکھتی ہوں۔ تو سعید
زمین پر لوٹ رہا ہے۔ اور حمید سے گیند مانگ رہا ہے۔ حمید ہی نگوڑا
کونسا بوڑھا تھا۔ اس ہی رمضان سے تو چار بھر کر پانچویں میں لگا تھا۔ انّا نے
نے بہتیرا کہا، مگر بچہ ہی تو تھا، اُسے بھی ضد آ گئی۔ گیند نہ دی۔ میری صورت
دیکھ کر سعید نے تو اور بلکنا شروع کیا۔ مگر حمید بالکل سہم گیا۔ اور جلدی
سے گیند سعید کے آگے ڈال دی، میرے کلیجے پر تو پہلے ہی چھریاں چل رہی
تھیں۔ حمید کی صورت دیکھتے ہی، غصے کے جوش نے بے تاب
کر دیا۔ میں بے تاب ہو کر اس کی طرف بڑھی، کہ کلیجے سے لگا کر خوب
روؤں۔ اس کا اس وقت سہم کر گیند پھینکنا، اور خاموش کھڑے ہو کر
میری طرف حسرت سے دیکھنا، میرے دل پہ ایک نشتر تھا۔ میں نے پاس
جا کر پیار کیا۔ ہاتھ پکڑ کر اوپر لے گئی، اور گلے لگا کر جتنا رویا گیا۔ خوب
روئی۔ بچے کا دل تو پہلے ہی زہر تھا، میرا چمکار کر پیار کرنا تھا کہ بلبلا اُٹھا
اتنا رویا کہ ہچکی بندھ گئی۔ میں نے پانی پلایا۔ تسکین دی۔ سعید سے گیند
لا کر اُس کے حوالہ کی۔ کھانا چونکہ باسی تھا۔ اس لیے بازار سے ناشتہ
منگا کر اُس کو کھلایا۔ بچہ ناشتہ دیکھ کر پچھلی باتیں بھول بھلا بھی گیا۔ مگر جس وقت
وہ کھا رہا تھا، اور میں کھلا رہی تھی، اُس وقت میرا دل جتنا خوش ہو رہا
تھا میں بیان نہیں کر سکتی۔ وہ دن، اور آج کا دن۔ میرا خدا دیکھتا ہے،
اگر میں نے حمید، سعید میں فرق کیا ہو، اپنے ساتھ کھلاتی، اپنے پاس

سُلاتی اپنے ہاتھ سے کپڑے پہناتی۔ مُنہ ہاتھ دُھلاتی، نعیمہ کا کہنا سچ تھا، نواں برس شروع ہوتا تھا، کہ باپ نے حمید کو علی گڈھ بھیج دیا۔ کبھی تیسرے، چوتھے مہینے دو چار دن کو آ گیا آ گیا ورنہ پھر وہ میری خدمت کا محتاج نہ تھا، لیکن ایمان کی بات یہ ہے۔ اب مجھے حمید کی مامتا سعیدہ سے کم نہیں۔

مجھے دنیا میں اِس کا پھل یہ ملا، کہ اللہ رکھے، چار بیٹوں تین بیٹیوں کی ماں ہوں۔ لڑکے تابع دار، لڑکیاں فرمانبردار، میاں غمگسار۔ شہر بھر میں میری تعریف ہے۔ کوئی گھر، کوئی کنبہ، کوئی محفل، ایسی نہیں ہوتی، جہاں میرا ذکر آئے۔ اور سب یہ نہ کہیں کہ "مری ہوئی بہن کے بچّے" کے ساتھ ایسی بنا ہی کہ سگی ماں کو بھلا دیا!! خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ جس نے مجھ کو عزت دی میرا مُنہ اس قابل نہ تھا۔ دنیا کا مرحلہ تو طے ہو چکا، اور میں فخر سے کہہ سکتی ہوں، کہ بہت اچھا طے ہوا۔ میری زندگی بہنوں کے واسطے ایک نمونہ ہوگی۔ اب سب سے بڑا مرحلہ عاقبت کا ہے۔ مجھ کو یقین ہے۔ کہ اُس کے حضور میں سُرخرو ہو کر جاؤں گی، اور جس وقت زندگی کے ایک ایک پل کا حساب، اور ایک ایک ذرّے کی بازپرس ہو گی۔ میں انشاء اللہ حق تلفی کی زبردست سزا سے محفوظ رہوں گی۔

عصمت ۱۹۱۱ء۔

دو دِن سُلطان بیگم پاس

بمبئی کے چند روزہ قیام میں یوں تو ایک سے ایک بڑھ کر چیز دیکھی مگر سب سے زیادہ جس چیز نے دل موہ لیا، وہ پیاری سلطان کا مکان تھا، مجھے اس کا بچپن اچھی طرح یاد ہے۔ اور اتنا کہ بچہ والی کو دیکھ کر وہ وقت یاد آ گیا۔ جب وہ خود بچّہ تھی، میں اس کی وداع میں موجود تھی، مگر اب نو برس بعد میرا اتفاق سے بمبئی آنا سلطان کا یہاں موجود ہونا اور میرا اس سے ملنے جانا۔ خدا کی عنایت ہی تھی، ورنہ میں کہاں اور پیاری سُلطان! کہاں

سُلطان، ایک ایسی ماں کی بیٹی تھی، جس نے شاید بھول کر بھی نماز قضا کی ہو۔ پھر عشا کے بعد دو تین گھنٹہ تک وہ سورتیں پڑھ کر عزیزوں کو پہونچاتی۔ صبح کے وقت کا وظیفہ، بیماری تک میں ناغہ نہ ہوتا۔ ایسی ماں کی گود سے نکل کر سلطان، اگر نماز، روزہ کی پابند، اور خوفِ خدا سے لرز جانے والی نکلی، تو تعجب نہیں مجھے پہلے ہی سے یہ توقع تھی، اور خدا کا شکر ہے کہ میری توقع پوری ہوئی سلطان، دولہا آٹھ سو روپیہ ماہوار کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہیں، جو پانچ برس ولایت میں رہے۔ اور اب پورے صاحب بہادر ہیں۔

ہیں دن کے دس بجے کوٹھی پر پہونچی، سلطان، میرے انتظار میں ٹہل رہی تھی۔ میری خبر سنتے ہی استقبال کو باہر آئی، اور گلے مل کر اندر لے گئی۔ اس کا گھر در حقیقت جنت کا نمونہ تھا ہر چیز قرینہ سے رکھی سلسلہ سے دھری، خوبصورتی سے سجی۔ بچے۔ سادے سدھائے ادب سے بیٹھے صحن دالان۔ کمرہ۔ صحنچی، کسی جگہ کوڑا تو درکنار کاغذ کا پرزہ تک نہیں

لباس قریب قریب، انگریزی تھا۔ مگر کیا کہنا تہذیب تھی، کہ بے ساختہ دل واہ واہ کر رہا تھا۔

چھوٹی بچی نے جھک کر سلام کیا، اور ہاتھ باندھ کر آگے کھڑی ہوگئی۔ پانچ برس کی جان مجھ سے پوچھتی ہے کہ

"کوئی خدمت میرے لایق"

ٹھیک بارہ بجے کھانا سامنے آیا، ایک ماما نے آکر ہاتھ دھلائے۔ دوسری نے آکر دسترخوان پر خالی برتن رکھے۔ تیسری نے آ کر پانی کا بھرا ہوا گلاس رکھا۔

پہلی اب پھر آئی، اور ضرورت کے لائق سالن ڈال دیا۔ یہ کیسا اچھا انتظام تھا، کہ کوئی دوسرے کے گلاس کو منہ نہ لگاتا تھا۔

ہم آٹھ آدمی میز پر تھے، کھانا کھا چکے تو ماما گرم پانی صابون تولیہ سیلا بچی لے کر حاضر ہوئی۔ کھانے سے فارغ ہوئی، تو ڈیڑھ بج چکا تھا گھنٹہ کا الارم بجا۔ اور سلطانہ بیگم، وضو کر نماز کو کھڑی ہوئی۔ میں کہہ نہیں سکتی۔ کہ اس پیاری بچی کو نماز کا ایسا پابند دیکھ کر کس قدر جی خوش ہوا ہے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد پورے آدھ گھنٹہ سلطان، نے کلامُ اللہ پڑھا، اور پھر میرے پاس آکر اس علیحدہ رہنے

کی معافی مانگی۔

عصر کے بعد کھانا پکانے کی طرف متوجہ ہوئی۔ ہرچند مامائیں تین تین اور چار چار موجود تھیں۔ مگر مغرب تک تمام کام اس نے اپنے ہاتھ سے انجام دیا۔

باوجود ہر قسم کی نعمت و برکت کے وہ ایسی خدمت گذار اور سلیقہ شعار بیوی تھی کہ میں اس کی تعریف نہیں کر سکتی اس نے بچوں کو ایسا اٹھایا کہ مجال نہ تھی کہ کوئی بچہ ذرا ضد یا ہٹ کر سکے۔

مختصر یہ کہ میں دو دن وہاں رہی اور تیسرے دن ہزاروں دعائیں دیتی ہوئی سلطان بیگم کے مکان سے رخصت ہوئی۔

عصمت ۱۵ء ۱۹ء

ایسی بیاہی سے کنواری بھلی

میکہ کی سیجوں پر شادی کا جو خواب اماں جان نے دکھایا اس کی تعبیر پوری ہوئی، اور تیرہ برس چھ مہینے کے بعد تحصیلدار صاحب رخصت ہوئے، اب باقی عمر کس طرح گذرے گی، اور یہ زندگی جس میں تین لڑکیوں کو پال پوس کر جوان کرنا اور بیاہ دینا ہے۔ کس طرح بسر ہوگی کون بتا سکتا ہے کاش اماں جان، تھوڑے روز اور زندہ رہ جائیں، تو دیکھ لیتیں، کہ وہ مجھ بدبخت لڑکی کا نکاح کیا کر رہی ہیں، دُنیا کی تمام مصیبتوں کا انبار میرے سر پر رکھ رہی ہیں، وہ عورت تھیں، افسوس، اور صدمہ، اس کا ہے۔ کہ ماموں جان نے مرد ہو کر ذرّہ بھر غور نہ کیا، اور ان مصیبتوں کا مطلق خیال نہ کیا۔ جو میرے نکاح میں چھپی ہوئی تھیں، میں صرف اس لیئے کہ میری زندگی دوسری ماؤں کے واسطے سبق ہو، اپنے واقعات پر ایک نظر ڈالنی مناسب سمجھتی ہوں۔

میں جب چودہ پندرہ سال کی تھی۔ یعنی اس دُنیا میں عمر کا وہ حصہ طے کر رہی تھی جس میں لڑکیاں میکے سے رخصت ہو کر سسرال پہنچ جاتی ہیں، تو اماں جان ہی نہیں ابا جان بھی میری شادی کے متعلق اکثر فکرمند رہتے تھے، اور اگر زیادہ نہیں تو دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں ایک

مرتبہ ضرور ان دونوں کی گفتگو میری شادی کے متعلق ہو جاتی تھی دونوں کو اس کا صدمہ تھا۔ کہ پیام کہیں سے نہیں آتا، یہ حالت مجھ اکیلی ہی کی نہ تھی کنبہ میں اور بھی پانچ چھ لڑکیاں اسی عمر کی بیٹھی تھیں، مگر پیام کہیں سے نہ آتا تھا، اس وقت تو مجھے کبھی اس کے اسباب تلاش کرنے کرنے کی ضرورت نہ ہوئی مگر آج میں یہ کہنے کا حق رکھتی ہوں۔ جو مسلمان اس بات کے شاکی ہیں، کہ بیٹیاں جوان ہو رہی ہیں اور بر نصیب نہیں، وہ براہِ کرم غور فرمائیں، کہ پیام کس طرح آئے پردہ کی وجہ سے لڑکیاں باہر نہیں نکل سکتیں بلکہ میں تو اس خاندان کی تھی جہاں کنواری لڑکیاں شادی بیاہ، یا کسی محفل، مجلس میں بھی نہیں جا سکتیں، اگر کبھی کسی عورت کے آنے کا ہمارے ہاں اتفاق ہوتا تھا۔ تو مجھ کو حکم تھا کہ آنے والی عورت کی آہٹ سنتے ہی فوراً آنکھ سے اوجھل ہو جاؤں۔ مجھے خوب یاد ہے۔ کہ مہینوں مجھے کسی غیر عورت کی صورت دیکھنے کا اتفاق نہ ہوتا تھا، میں پردے کی مخالف نہیں ہوں، مگر یہ معلوم کرنا ضرور چاہتی ہوں، کہ ان حالات میں جبکہ لڑکی کی صورت شکل سات پردہ میں چھپائی جائے نکاح کا پیام کون دے؟ اور کیونکر آئے؟ اس پر بھی پیام کا آنا اندھے کی بٹیر سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ اس مسئلہ پر غور تو بڑے ہی آدمی کریں گے۔ لیکن مجھے تعجب ہے۔ کہ باوجود اسلام کے صریح احکام کے جن میں مرد کو اجازت دی گئی ہے۔ کہ وہ عورت کو دیکھ لے نکاح کا یہ طریقہ کہ صرف اتنا معلوم کرکے بلکہ سن کر۔ کہ فلاں گھر میں ایک لڑکی قابل نکاح ہے۔ لڑکی والوں کا پیام کی توقع رکھنا، اور نا خیر پریشاں کی ہونا کہاں تک جائز ہے۔

قصہ کوتاہ، چھ برس اسی طرح گذرے، اور پیام نکاح تو در کنار کسی نے

یہ بھی نہ پوچھا، تمہارے منہ میں کے دانت ہیں۔ ابا جان یہ ارمان اپنے دل میں لے گئے، دادی جان جو ہر وقت دعائیں دیتی تھیں، کہ "ٹھنڈی رہو" وہ بھی چل دیں، خدا خدا کرکے بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا اور ان تحصیلدار کا پیام آیا، وہ بھی خدا بھلا کرے۔ ابا جان کے ایک دوست تھانیدار صاحب کا جن کے کام میں یہ بھنک پڑی ہوئی تھی کہ میر صاحب مرحوم کی ایک جوان لڑکی بیاہنے کو بیٹھی ہے۔ پیام کے آتے ہی سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا، اماں جان کی ہر وقت باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ ابھی بات چیت طے نہ ہوئی تھی صورت اور مزاج دیکھا نہ تھا۔ عادت، وخصلت سے واقف نہ تھیں، مگر ہر شخص سے تحصیلدار صاحب کی تعریف تھی، آوازیں میرے کان میں بھی آرہی تھیں، کہ تحصیلدار صاحب پچاس برس کے بڈھے ہیں، بیٹے ہیں، پوتے ہیں۔ نواسے ہیں، نواسیاں ہیں۔ مگر مجال نہ تھی، کہ زبان سے اُف کرسکتی۔ دو ہزار روپیہ مہر پر نکاح ہوا۔ اور میں تحصیلدار صاحب کے پلّے باندھ دی گئی۔ مجھے انکے خلق و محبت کا اعتراف ہے۔ انھوں نے میری خاطر مدارات میں کمی نہ کی مگر بعض باتیں یقیناً میری مرضی کے خلاف تھیں۔ اور ہمیشہ رہیں مثلاً شادی کو مشکل سے بیس پچیس روز ہوئے ہوں گے، کہ انھوں نے مجھ سے فرمائش کی "بیگم! یہ دو چار سفید بال چن دو"۔ طوعاً و کرہاً۔ اٹھی، اور حکم کی تعمیل کی، شادی کو تیسرا سال تھا، کہ تحصیلدار صاحب نے خضاب لگانا شروع کیا۔ گھر میں دو دو مامائیں تھیں باہر تین چار نوکر تھے، تیسرے چوتھے دن نائی بھی آتا تھا، مگر فن خضاب کی ماہر بیگم ہی تھی، کہ ہر اتوار کو پلنگ سے اٹھتے ہی، گوشت ترکاری کے ساتھ ارنڈ کے پتّے منگوانے فرض تھے۔ دوپہر کے ایک دو بجے تک، جب تک ان کا سر اور ڈاڑھی نہ دھلوالوں کھانا نہ

خود کھا سکتی تھی، نہ کسی کو دے سکتی تھی، خیر اس کا بھی مضائقہ نہیں، ایک دن رات کو دس بجے جو ڈاڑھ میں درد شروع ہوا ہے۔ تو ساری رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ پھٹکری کی کلیاں ہوئیں۔ عقر قرا دیا گیا۔ دو بجے رات کے بادام کے چھلکوں کا منجن بنا۔

مختصر یہ کہ ڈاڑھ کمبخت جب تک نکل نہ گئی نہ تحصیلدار صاحب کو خود چین پڑا نہ دوسروں کو۔ تین مہینے بعد درد سر کا دورہ ہوا، اور وہ بھی ایک مختصر روگ پیچھے لگا۔ اس سے فارغ نہ ہوئی تھی کہ دوسری ڈاڑھ چلی، آٹھ دن اس پریشانی میں گذرے۔

غرض شادی کے دو تین سال خیر خاصے گزر گئے مگر اس کے بعد شاید ہی کوئی ایسا مبارک دن ہوتا ہوگا کہ میرے شوہر یعنی تحصیلدار صاحب تندرست رہتے ہوں۔ ورنہ آئے دن ایک نہ ایک شکایت موجود تھی۔ اماں جان شادی کے پانچ برس بعد دنیا سے رخصت ہوگئیں، اور اپنی دانست میں میری شادی کا فرض نہایت اچھی طرح سے ادا کر دیا مجھے اعتراف ہے کہ تحصیلدار صاحب نے محبت یا دلداری میں کمی نہ کی۔ روپیہ بھی میرے پاس ہمیشہ موجود رہا، زیور اور کپڑا بھی اچھا اور بہت اچھا۔ اور اماں جان بھی جب تک زندہ رہیں اسی کو دیکھ دیکھ کر نہال ہوتی رہیں، مگر میں کچھ آج ہی نہیں۔ اس وقت بھی زندگی سے اکتا سی گئی تھی۔ اور ہمیشہ اس نتیجہ پر پہنچی تھی، کہ شادی کے جو معنی ہیں وہ میری شادی سے پورے نہیں ہوئے۔ اس میں شک نہیں کہ بیوی مرد کی سب سے زیادہ رفیق ہونی چاہیئے۔ اور بڑھاپے میں بیوی سے زیادہ شوہر کا مددگار اور کوئی نہیں ہو سکتا مگر رفیق، اور شفیق وہی بیوی ہو سکتی ہے جو جوانی میں شوہر کے ساتھ رہ کر تمام خوبیاں دیکھ چکی ہو

خود بھی اگر بڑھیا نہ ہو تو بڑھاپے کے قریب آگئی ہو یہ فطرت انسانی ہے۔ اور
خلاف فطرت توقع قطعًا ناجائز ہے۔ ایک جوان لڑکی سے یہ امید رکھنی کہ وہ بڈھے
پھونس شوہر کے جنازہ پر رات بھر آنسو گرائے یا اس کے مرض الموت میں
مہینوں رات رات بھر جاگتی رہے۔ اور تیوری پر بل نہ لائے درست نہیں۔

میری عقل کام نہیں کرتی کہ اس کھلے ہوئے ثبوت پر بھی کہ
ہندوستان میں ہزاروں لاکھوں بیوہ عورتوں نے سسرال میں یا ماں
باپ کے گھر پر اور بہن بھائیوں کے سامنے رنڈاپا کاٹ دیا۔ لڑکی کا نکاح
اسی حد تک کیوں فرض سمجھ لیا گیا ہے کہ بڈھا پھونس ہی کیوں نہ
ہو۔ مگر نکاح کر دیا جائے؟ آخر رانڈیں اپنی عمر کیوں کر بسر کر دیتی
ہیں؟ حالانکہ شادی کے نتائج سے باخبر ہو جاتی ہیں۔ پھر کنواری لڑکی جو
شادی سے قطعًا ناآشنا ہے کس واسطے کنوئیں میں دھکیلی جاتی ہے؟

تحصیلدار صاحب تشریف لے گئے میرے پاس زیادہ سے زیادہ
دو ڈھائی ہزار کا زیور ہے۔ اور اُن کی پہلی بیوی کے بچے اس کا بھی مطالبہ
فرما رہے ہیں۔ تین لڑکیاں ساتھ ہیں ان کا انجام کیا ہوگا، کچھ سمجھ میں
نہیں آتا۔ میں اپنی دردناک زندگی کا ایک مختصر سا پہلو دکھا کر ان ماؤں سے جو
اپنی جوان بچیوں کو بڈھے شوہروں کے حوالہ کر دیتی ہیں، التجا کرتی ہوں کہ
وہ ایسے سنگین جرم کا ارتکاب نہ کریں، اور مجھ جیسی رانڈ سے کنواری کو
ہزار درجہ بہتر و غنیمت سمجھیں۔

عصمت ۔ سنہ ۱۹۲۵ء

بی انجم

بی انجم عقل مند تو سدا ہی کی تھیں، ایک دن بیٹھے بیٹھے جی میں کیا آئی، کہ چلو گیتی آرا بیگم ہی سے مل آئیں، اُس دن جلسہ میں کیسی محبت سے ملی ہیں چلتے چلتے کہہ گئی تھیں، کہ میرے ہاں، ضرور آیئے گا، ان بیچاری کی عنایت تو بہت کچھ کہ پہلی ملاقات، اور اتنی محبت، اور میری بے مروّتی کا یہ حال، کہ اقرار تک کر لیا اور خاک پورا نہ کیا۔ اب آج سے اچھا اور اس وقت سے بہتر موقعہ کونسا ملے گا۔ بچے دونوں ددھیال گئے ہوئے ہیں سکندر کو گھر میں بٹھا، بڑی بی کو ساتھ لے، ہو آؤں۔ کچھ ایسا دور بھی نہیں، فقط کپڑے بدل لینے ہیں، سو اب بدلے البتہ ذرا ناوقت ہو گیا ہے۔ تو جان پہچان میں وقت اور ناوقت کیسا جس وقت فرصت ملی۔ اور موقعہ ہوا وہی وقت ہے۔ لاکھ ناوقت ہو مگر گیتی آرا بیگم، جیسی بیوی صورت دیکھتے ہی نہال نہال ہو جائیں گی۔

مئی کا گرم مہینہ تھا، اور گو آفتاب ڈھل چکا تھا، مگر پھر بھی گرمی اس قیامت کی تھی، کہ چاروں طرف آگ برس رہی تھی، سڑک پر اکّا دُکّا کوئی ضرورت کا مارا رستہ چلتا نظر آجاتا تھا، ورنہ میدان صاف مصیبت کے مارے راج مزدور تو بیشک ٹوکریاں ڈھو ڈھو کر پاڑ پر پہونچا رہے تھے، ورنہ کس کی ہمت تھی، کہ دم بھر بھی لو کے جھکڑ کا مقابلہ کر سکتا تین بج کر دس منٹ ہوئے تھے، کہ ڈولی میں بی انجم

اور پیچھے پیچھے بڑھیا شش و پنج میں پہونچی۔
کیپٹن آرا بیگم، کا گھر تو مغربی تہذیب کا پورا نمونہ تھا میاں اسسٹنٹ سرجن۔
بیوی حد درجہ کی وہمی، شہر میں ہیضہ پھیلا ہوا، ماما تک کی مجال نہ تھی، کہ گھر سے
باہر نکل کر فوراً گھر میں گھس گئی بدقسمتی سے اوسی روز اوسی صبح پڑوس میں ایک
ایسی جوان موت ہوئی کہ وہ ہمن کا رہا سہا سکت بھی جاتا رہا۔ اتوار کا دن تھا
ڈاکٹر صاحب بھی گھر ہی میں تھے، اور دروازے دونوں بند حکم چڑھا ہوا کہ اگر کوئی
بیمار بھی آئے تو ٹالدو۔ اس صورت اس حالت اس آفت میں بی انجم
کی ڈولی دروازے پر پہونچی، اور کہاروں نے آواز دی "سواری اوتروالو"
گھر میں خبر پہونچی تو خیر مشکل تھی، السطنت یہ تھا کہ باہر کا نوکر بھی کوٹھری میں
پڑا استا رہا تھا۔ کہار بہتیرا چیخ رہے ہیں، بڑی بی ہر چند چلا رہی ہیں مگر
کوئی ہو تو بولے، اور سُنے تو جواب دے۔ گرمی کے مارے یوں ہی جان نکلی
جا رہی تھی۔ ڈولی میں گھٹے گھٹے بی انجم، اور بھی بے اوسان ہو گئیں۔ غصہ کرنے
اور جھونجل اوتارنے کو لے دے کر ایک بڑی بی۔

انجم۔ "بڑھیا، تیری عقل تو نہیں جاتی رہی، اندر جا کر کیوں نہیں کہتی، کہ
داروغہ جی کی صاحبزادی آئی ہیں"۔

بڑھیا۔ "بیوی واہ! کہوں کس سے، اور جاؤں کیونکر، دیوار پھاندوں
سے کہوں یا کواڑوں سے، دروازہ بھڑا ہوا کنڈی لگی ہوئی، آدمی کا نام نہیں
چیخنے کو چیخے جاؤں۔ یہ بھی کسی کے ہاں آنے کا وقت ہے؟"

انجم۔ "تو میری دادی ہے یا نانی۔ وقت کی ٹوکنے والی تو کون؟ مردار کنڈی
کیوں نہیں کھٹکھٹاتی"۔

بڑی بی۔ "بھلا بیوی اس خواہ مخواہ کے غصہ سے، حاصل کیا کہار پر بس

نہ چلا گدھیا کے کان امیٹھے قصور اپنا غلطی اپنی سر ہو گئیں میرے ۔"
انجم "بڑھیا کم بخت ۔ نمک حرام ۔ بے وقوف ۔ چڑیل ۔ اتنی جوتیاں ماروں گی کہ بھیجا نکل پڑے گا ۔ جا نکل جا یہاں سے خبردار جو صورت دکھائی ہو گی ۔ کہارو تم کنڈی کھٹکھٹاؤ ۔"
کہار "سرکار ۔ اتی دیر سے جنجیر بجاوت ہیں ۔ اب کو ؤ سنے نہیں تو ہم کا کریں"
انجم ۔ "ارے تو بے ایمانوں کسی سے پوچھو تو سہی ۔ کہ ڈاکٹر صاحب کا گھر یہی ہے"
ڈاکٹر صاحب کا نوکر " کون ہے ۔ کون ہے ؟"
بڑھیا ۔ "شکر ہے خدا کا ۔ بھائی ادھر تو آ"
نوکر "کہاں سے آئی ہے ڈولی ۔ ؟"
بڑھیا " اجی توبہ ۔ بھائی ایسے گھوڑے بیچ کر سوتا ہے ۔ کہ خبر ہی نہیں "
نوکر "تو اپنا مطلب کہہ ۔ سوئیں نہ سوئیں ۔ تو کون ؟"
بڑھیا "دور ۔ تو تکار سے کیوں بولتا ہے ؟"
نوکر "بول بول سواری کہاں سے آئی ہے ؟"
بڑھیا ۔ "دروغہ جی کے ہاں سے آئی ہے ۔ اور کہاں سے آئی ہے "
نوکر "کسی کے آنے کا حکم تو ہے نہیں ۔ اگر خبر کئے دیتا ہوں ۔ اور آج سرکار بھی گھر ہی میں ہیں ۔"
نوکر نے چھوٹے دروازے پر جاکر ماما کو بلایا ۔ اور سواری کی اطلاع اندر ہوئی ۔ گیتی آرا بیگم ۔ میاں کے دورے پر جانے کے صندوق ۔ کپڑے ۔ اسباب ۔ بچھونا ۔ وغیرہ ٹھیک کر رہی تھیں ۔ ان کو اس وقت دم مارنے کی فرصت نہ تھی ۔ گاڑی کا وقت سر پر چلا آ رہا تھا ۔ اور کام بہت کچھ باقی تھا ۔ سواری کی خبر سنکر بہت ہی جز بز ہوئیں ۔ ملتی ہیں تو میاں کا اسباب یوں ہی رہتا ہے ۔ نہیں ملتیں تو بے مروتی ۔

کج خلق، مغرور۔ دماغ دار بنتی ہیں۔ ادھر ہیضہ کا اندیشہ، اصول کا لحاظ، ادھر گھر پر آیا آدمی، دروازے پر ڈولی، مختصر یہ کہ دروازے کھلے، اور بی انجم اندر داخل ہوئیں چہرہ تمتمایا ہوا، پھیپھڑیاں بندھی ہوئی، غصہ سے سرخ، گرمی سے پسینے پسینے۔ گیتی آرا بیگم، اپنی معزز مہمان کے استقبال کو دروازے پر موجود تھیں، سلام کیا، ہاتھ ملایا۔ مگر بی انجم، کے غصہ کا کیا ٹھکانا تھا، چھوٹتے ہی کہتی ہیں۔

"واہ بوا واہ، خدا نہ کرے کہ کوئی تمہارے گھر پر آئے، اچھی مٹی پلید کی، دو گھنٹے سے ڈولی پٹخی پڑی ہے۔ اور کوئی پوچھنا تک نہیں!"

گیتی آرا بیگم۔ "آئیے آئیے اندر تشریف لے چلئے، میں آپ کے تشریف لانے کی بے حد ممنون ہوں، ایک ضروری کام میں مصروف تھی۔ اس وجہ سے خبر نہ ہو سکی!"

انجم۔ "اچھی یہ دن دہاڑے دروازہ بند کرنا کس خدا نے بتایا ہے؟"

گیتی آرا بیگم۔ "آج کل اس محلہ کی ہوا خراب ہو رہی ہے۔ اس لئے یہ احتیاط کی ہے کہ آمد و رفت میں کمی ہو۔ آپ اگر مجھے پہلے سے آنے کی اطلاع دے دیتیں، تو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوتی۔ میں اس وقت ڈاکٹر صاحب کے اسباب کی درستی میں مصروف ہوں۔ وہ پانچ بجے کی گاڑی سے جا رہے ہیں!"

انجم۔ "مجھے کیا خبر تھی، کہ آپ کو فرصت نہ ہوگی، نہیں تو آنے ہی کا ارادہ نہ کرتی، اب آگے کو کان پکڑا۔ اس دن جو آپ نے، اس طرح تاکید سے کہا تو میرا جی بھی چاہا۔ ورنہ میں تو خود ہی نہ کہیں جاؤں، نہ آؤں

جلسہ میں بھی جمیل کے سر ہونے سے چلی گئی تھی۔"

گیتی آرا بیگم۔"آپ تشریف لائیں، تو بہت اچھا کیا، میں آپ سے مل کر بہت خوش ہوئی، آپ یہاں بیٹھئے مجھ کو آدھ گھنٹے کی اجازت دیجئے، اس کے بعد حاضر ہوں گی۔"

انجم۔"جی نہیں، اب میں جاتی ہوں۔ بڑی بی چلو، رخصت۔"

عصمت ۱۹۱۰ء

کائنات کا مطالعہ

ہم فرشتوں کے پاس، لاکھ دل، اور مادۂ احساس نہ ہوا مگر کائنات کا مطالعہ ہم سے زیادہ کون کر سکتا ہے! ہماری رائے قطعی ہوگی۔ ہمارا فیصلہ یقینی ہوگا! اور ہمارا خیال بالکل سچا۔ میں وہ ہوں! جو آج سے دوسو برس پہلے اس خدمت پر مامور تھا! کہ عالم حیات کی زندہ روحوں تک قدرت کا یہ پیغام ہر صبح پہنچا دوں!

"مکاں بناؤ ڈھنے کے واسطے اور بچے پیدا کرو موت کے لئے

ایسا مکاں بناؤ جو بن کر گرا نہ ہو پیدا ہوا ہے کوئی بشر جو مرا نہ ہو"

جب میں اپنے درجہ میں ترقی کر گیا! اور مجھ کو چند فرشتوں کی سرداری مرحمت ہوئی! تو ایک روز (تسبیح و تحمید) بارگاہ ایزدی سے اجازت لے کر کائنات کے مطالعہ کو روانہ ہوا۔ انسان (تسبیح و تحمید) بارگاہِ ربّ العزت سے یہ خطاب پا چکا ہے۔

"مارا جائیو! انسان کیسا ناشکرا ہے!!"

میرا گذر ایک ایسی جگہ ہو جہاں محفل رقص و سرود جمی ہوئی تھی! باجے بج رہے تھے۔ ناچ گانا ہو رہا تھا! اور اس بستی کے تمام امراء و رؤسا اس صحبت میں (تسبیح و تحمید) باری تعالے کے پیغام کو جو ہر روز ان تک

پہنچاہے۔ بھولے ہوتے تھے ۔ یہ ایک رئیس شہر کے بیٹے کی شادی تھی ۔ جس نے خزانوں کے منہ کھول دیئے۔ اور روپیہ کوڑیوں کی طرح خرچ ہو رہا تھا۔ ایک نہیں بیسیوں خدا کے محتاج بندے کھانے کے وقت منتظر تھے صاحب خانہ کے اس حکم کے کہ شاید ان بیسیوں دیگوں ۔ اور منوں چاولوں میں تھوڑا سا حصہ ان کی تقدیر کا بھی ہو ۔ مگر وہ ناکام چلے گئے ۔ اور مہمانوں کی تواضع میں کھانے کا بہت سا حصہ اس مخلوق کی ضرورت سے زیادہ رائیگاں گیا۔ مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی ۔ اور میں کم بخت انسان کی سرشت پر ملامت کرتا ہوا آگے بڑھا۔ برابر میں ایک شادی تھی ۔ مگر یہ ایک بن باپ کی بچی کی تھی ۔ جس کو ایک بیوہ ماں اپنے گھر سے رخصت کر رہی تھی ۔ اس کی آنکھ سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی تھیں ۔ لاوارث تھی ۔ بے کس تھی ۔ اور اس کے گھر میں کوئی اتنا بھی نہ تھا ۔ کہ تسلی و تشفی تو در کنار افلاس کی مصیبت میں اس کا ہاتھ بٹائے وہ بن کر بگڑنے والی بیگم ۔ اور عروج سے زوال میں آنے والی ۔ ایک زندہ روح تھی ۔ اپنی بے کسی پر اس کا کلیجہ شق ہو رہا تھا ۔ اور وہ چاروں طرف اس امید پر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی تھی ۔ کہ شاید خدا کا کوئی نیک بندہ میری مصیبت کا شریک ہو جائے۔ مگر اس کی توقع انسانی دنیا سے پوری نہ ہوئی ۔ اور میں بھی (تسبیح و تحمید) باری تعالےٰ کے ارشاد پر آمنّا و صدقنا کہتا ہوا واپس آیا۔

اس واقعہ کے چند ہی روز بعد میرے عزیز بھائی "ملک

المیوت" نے ایک ذلیل رُوح لاکر پھینکی - یہ اُسی شقی القلب انسان کی تھی جو خُدا کے سچے حکم اور قدرت کے معقول انتظام کو بھول چکا تھا ، جس کے فنا ہونے والے اعضار اور ختم ہو جانے والی زندگی ، اپنی پڑوسن بیوہ کے کام نہ آسکی - میں (تسبیح و تحمید) اپنے ربّ العزت کے حکم سے اُٹھا اور اس سخت عذاب کے ساتھ ، جو اس پر نازل ہوا ، زر و جواہر کے ڈھیر اس کے آگے ڈال دیئے ، عذاب کی سختی لحمہ بہ لحمہ تیز ہو رہی تھی ، اور یہ سنگ دل چیخیں مار مار کر رو رہا تھا - بالآخر اس نے بآواز بلند چیخنا شروع کیا ، اور کہا -

دُور ہو ! ہٹ جا - پرے ہٹ جا !! - ارے کم بخت دولت تُو نے میری انسانیت پر کیسا بٹّا لگایا ! میرا دل ، میرا ضمیر ، میرا ایمان ، مجھ سے چھین لیا - اور رحم جو انسانیت کا سب سے بڑا جوہر تھا - مجھ سے جُدا کر دیا -

غارت ہو جا - ارے کم بخت دولت ! خدا کی ہزارہا مخلوق بھُوکی سوئی ، اور میں نے پیٹ بھرا ! دُور ہو ! دُور ہو ! دُور ہو !

اے ضرورت سے زیادہ دولت !! تو نے میری آنکھوں پر پردے ڈال دیئے ، اور مجھ کو آج یہ دن دکھایا !

"دُور ہو ، اے کم بخت دولت ، میرے پاس سے دُور ہو ، ہٹ ہٹ اے زر و جواہر کے ڈھیر پرے ہٹ ، غارت ہو"

ابھی اس گنہگار کی گریہ و زاری ختم نہ ہوئی تھی - کہ برابر سے ایک روح نے صدا دی -

"میرے پاس آ! آ! اے دولت میرے پاس آ! آ! میں تجھ سے کام لوں گا اور اس لیے کہ تو آزمایش کی چیز ہے۔ قدرت کے امتحان میں پورا اُتروں گا الخلق عیال اللہ۔ میرا عمل پورا ہو گا۔ دنیا میں میری بہنیں ہوں گی، بن باپ کے بچے، بن ماں کی اولاد۔ میرے کلیجے کے ٹکڑے ہوں گے، انہیں کھلا کر کھاؤں گا اور سُلا کر سوؤں گا۔"

عصمت۔ ستمبر ۱۹۱۴ء

ضمیر کی آواز

دن کے روشن چہرہ پر رات کی کالی نقاب پڑ چکی تھی، آسمان پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ رہ رہ کر بجلی، اور تھم تھم کر بادل چمک، اور گرج رہے تھے۔ عائشہ، اپنے مکان میں تن تنہا بیٹھی ہوئی، اپنے شوہر کا انتظار کر رہی تھی۔ اندھیرا ایسا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھائی دے تنہائی ایسی کہ پڑوس تک سے کسی کے بولنے کی آواز نہیں۔ عورت ذات رات کا وقت برسات کے دن اکیلی بیٹھی۔ اللہ اللہ کر رہی تھی، اور دل دھکڑ دھکڑ کر رہا تھا۔ ذرا سا کھڑکا ہوا۔ اور جان نکلی، دیوار میں سے مٹی جھڑی اور کلیجہ بلیوں اچھلنے لگا، خدا خدا کر کے کوتوالی کا گھنٹہ بجا، آٹھ تک گن چکی تھی، کہ بادل نے کڑک کر دل دہلا دیا۔ سب بھول بھلا چیز بست چھوڑ چھاڑ۔ اندر مسہری پر جا لیٹی۔ بجلی کی چمک یہاں بھی آنکھوں میں گھسی جاتی تھی۔ کواڑ بھیڑے، آنکھیں بند کیں، اور ہاتھوں سے منہ چھپا چپکی بیٹھ گئی۔ طرح طرح کے خیالات دل میں آتے تھے، میاں کا لڑکپن لڑکوں کی بے پروائی، دونوں بہنوں کا الگ تھلگ رہنا، ایک جھگڑا تھا، کہ بندھا چلا آتا تھا، سوچتے سوچتے خیال آیا، کہ ایک دفعہ ابا جان اماں جان سے کہہ رہے تھے۔ کہ رابعہ بصری ایک دن غور کرنے لگیں۔ کہ پچاس برس کی عمر ہونے آئی اگر ایک گناہ بھی کیا۔ تو اب تک کے کتنے ہوئے۔ حساب لگاتے ہی ایک چیخ ماری

اور گر پڑیں۔ وہ بھی آدمی تھیں۔ اور میں بھی آدمی ہوں۔ میں نے آج تک کتنے کام اچھے۔ اور کتنے برے کیے۔ بچپن ختم ہوا۔ جوانی ڈھل چکی بڑھاپا آپہنچا ہوا۔ اور کوئی دن میں یہ بھی رخصت۔ بچپن اور جوانی جاکر تو کچھ اپنی نشانی چھوڑ بھی گئے۔ بڑھاپا جاکر اگر کچھ چھوڑے گا تو مٹی کا ڈھیر۔

اِسی اُدھیڑ بن میں غلطاں پیچاں باہر کے دالان میں آئی۔ جھانک کر دیکھا تو موسلا دھار پانی پڑ رہا تھا، کڑک نہ تھی، مگر بجلی کبھی کبھی چمک جاتی تھی۔ لوٹی اور لوٹ کر پھر آ بیٹھی، آئی تو پھر وہی عائشہ تھی، اور وہی اُدھیڑ بن سوچنے لگی، کہ آخر میں نے اب تک کیا کیا۔ شروع سے چلوں۔ کواری رہی، تو ایسی رہی، کہ خدا دشمن کو ایسی بیٹی نہ دے۔ موت کا وقت مقرر سہی، مگر سچ پوچھو تو اماں جان کو فقط میرے جلاپے نے کھایا، کس محبت سے سمجھاتی، اور پیار سے بتاتی تھیں، مگر میرے کان پر کبھی جوں نہ چلی، ان کی محبت بھری باتیں، اور مجھ ناہنجار کی زبان، الامان الحفیظ! میں کیسے بھر منہ کوستی تھی، اور چپکی بیٹھی مُنہ کر تکتی تھیں! اب پچتائے کیا ہوت ہے، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ روؤں، پیٹوں۔ چیخوں۔ چلاؤں۔ مگر اماّں کہاں! دنیا چھان ڈالوں، اور ہزاروں جتن کر ڈالوں۔ مگر وہ صورت نصیب نہیں۔

بیوی بنی تو ایسی بنی، کہ ہمدردی اور فرمانبرداری۔ تو درکنار میاں سے سیدھے مُنہ بات تک کرنی نصیب نہ ہوئی۔ جب رہی ٹلینٹ رہی، آخر کب تک اثر نہ پڑتا جب تک برداشت ہوسکی کی۔ ایمان کی بات یہ ہے۔ کہ اب تک کر رہے ہیں۔ اگر میں شروع ہی سے دل میں گھر کرتی اور یہ اچھی طرح سمجھ لیتی کہ زندگی ان ہی کے ساتھ بسر کرنی ہے جس طرح ہو ان کو رضامند رکھوں تو آج کیوں یہ مصیبت جھیلنی پڑتی۔

ماہنی تو نورٌ علیٰ نور۔ تعلیم تو خیر دوسری چیز ہے تربیت جو میرا ضروری فرض تھا کبھی بھول کر بھی اس کا دھیان نہ کیا۔ جھوٹ ان سے بولی۔ دھوکے انہیں دیئے۔ ادب انہیں نہ سکھایا، تہذیب انہیں نہ بتائی۔ بے ڈھنگے پھرے تو، آوارہ رہے تو، ان کی عمر کا خیال مجھے نہ آیا۔

انا ناخوش گئیں، اس کا تو علاج ہی نہیں۔ خاوند کو رضامند نہ رکھا۔ اس کا نتیجہ دیکھ رہی ہوں۔ لڑکوں سے غافل رہی اس کا مزہ چکھا۔

افسوس صد افسوس میری اس اُلٹی مت پر دنیا یوں گزری، آخرت کا مرحلہ ابھی طے کرنا باقی ہے۔ جہاں تِل تِل، اور رتی رتی کا حساب دینا پڑے گا۔

خیر! آج سے عہد کیا کہ انشاء اللہ شوہر کی خوشی اپنا فرض سمجھوں گی۔ اس عہد پر خدا کو گواہ کرتی ہوں۔ کیچڑ میں لت پت آئیں گے، پانی کا لوٹا بھر کر رکھوں۔ تولیہ ڈالوں۔ کھانا چولھے پر رکھ دوں۔

مینہ، تھم چکا تھا، عائشہ پانی کا لوٹا بھر کر رکھ چکی تھی۔ کہ سامنے سے شوہر یہ کہتا ہوا آیا "کس غضب کی کیچڑ ہے۔ کہ راستہ چلنا بھی مشکل ہو گیا"

عصمت، ۱۹۱۰ع

شوہر کا استقبال

زہرہ کی انتہائی قدامت پسندی نے اس کے شوہر صمصام کو بعض خوشیوں سے بُری طرح محروم کر رکھا تھا، نئی تہذیب کا وہ خود ہی دلدادہ نہ تھا، مگر یہ بھی نہ چاہتا تھا کہ بیوی پرانی لکیر کی فقیر رہے۔ اور ان نئی باتو سے جو معاشرت میں داخل ہو کر مفید ثابت ہوئی ہیں، سانپ کی طرح ڈرتی رہے۔ زہرہ کو پایریا (دانتوں کے مرض) کی شکایت شروع تھی، صمصام نے ڈاکٹر کی ہدایت کے بموجب برش اور پاؤڈر لا کر دیا، اور کئی مرتبہ کہا، مگر اس نے اپنے پرانے منجن کے سوا کسی پاؤڈر کو ہاتھ نہ لگایا۔ خربوزے ساتھ کھانے کا اتفاق میاں بیوی کو کئی مرتبہ ہوا، اور صمصام نے ہمیشہ کہا، کہ "کانٹے سے کھالو!" مگر اس نے پسند نہ کیا۔ زہرہ اچھی طرح جانتی تھی، کہ صمصام جنوبی ہندوستان کا رہنے والا ہے۔ جہاں ساری زنانہ لباس کا جزو اعظم ہے، اور اسی وجہ سے وہ اچھی اچھی ساریاں لایا، مگر اس لیئے، کہ دہلی کے مسلمانوں میں اس کا استعمال کم ہے۔ زہرہ نے کبھی نہ باندھی۔

یہ ایسی باتیں تھیں جن کا اثر صمصام خاموشی کے ساتھ اپنے دل پر لے رہا تھا، دہلی کا لباس اس کو مطلق پسند نہ تھا، چنانچہ اس نے کئی دفعہ اظہار ناپسندیدگی کیا بھی، لیکن زہرہ نے اس کی پرواہ نہ کی، نتیجہ یہ ہوا۔

کہ جب صمصام کی وہ توقعات جو اس نے بیوی سے قایم کی تھیں پوری نہ ہوئیں۔ تو وہ اکثر خاموش رہنے لگا۔

ناھلہ کی بابت یہ خیال کرنا غلط ہے۔ کہ اس میں ضد یا نافرمانی کا مادہ موجود تھا۔ وہ فرمانبردار تھی، اور چاہتی تھی، کہ صمصام کی خوشیاں پوری کرے، مگر کچھ دستور و رسم کی وجہ سے کچھ شرم و حیا کے باعث، اس کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ کہ نیا طریقہ اختیار کرے۔

(۲)

کنبہ میں ایک شادی ٹھہری۔ اس کی اطلاع صمصام کو اس وقت ہوئی، جب ناھلہ، شرکت کے واسطے تیار ہوئی، اور اس نے نئی جوتی کی خواہش ظاہر کی۔ صمصام فوراً بازار گیا، اور جوتی لے کر آیا، ناھلہ کا سمجھ رہی تھی، اور کہہ بھی دیا تھا، کہ "دہلی کی سلیم شاہی جوتی سلمہ کی لانا" اور صمصام نے کوشش بھی کی، مگر چونکہ دہلی کی جوتی اس کو پسند نہ تھی اور روپیہ صرف کرتے ہوئے اس کا دل دکھتا اس لئے وہ انگریزی پمپ لایا ناھلہ، دیکھ کر منہ سے تو کچھ نہ بولی، جوتی اُٹھا کر رکھ دی، اور جب بالکل تیار ہو کر چلنے لگی تو پرانی جوتی پہن لی، یہ ایسا واقعہ تھا، جس نے صمصام کی امیدوں کو خاک میں ملا دیا، اور آج اس کو یقین ہو گیا، کہ جب میری خواہش کا رتی بھر وزن بھی ناھلہ کی نگاہ میں نہیں، اور میری محبت و محنت کی اسے ذرہ بھر پرواہ نہیں، تو میں اس سے کیا توقع رکھ سکتا ہوں، اس کو ناگوار ہوا، غصہ آیا مگر ضبط کیا اور خاموش رہا۔

ناھلہ، شادی سے لوٹی تو بجائے اس کے کہ وہ صمصام کی دونو خواہشوں، ساری، اور جوتی کو پورا نہ کر سکنے سے نادم ہوتی، الٹی شکایت

کرنے لگی۔ صمصام، صرف اس وجہ سے، کہ وہ زاہدہ سے غیر معمولی محبت کرتا تھا، خاموش بیٹھا، اس کی سنتا رہا۔ زاہدہ اس کی خاموشی سے جو خلاف عادت تھی متاثر تو ضرور ہوئی، مگر نامعلوم کس مصلحت سے اُس نے اپنے اس اثر کا اظہار مناسب نہ سمجھا،

(۳)

صمصام، کو تین مہینہ کے واسطے خلاف توقع کسی فوری حکم کے ذریعہ سے دورہ پر جانا پڑا، یہ دورہ اس قدر تکلیف دہ تھا، کہ ہر شخص جانے سے گھبراتا تھا، مگر صمصام کو جانے کے سوا چارہ نہ تھا۔ اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی، کہ وہ تحصیلداری کا امیدوار تھا، اور ملازمت کے سلسلہ میں یہ ہی اس کی منزل مقصود تھی، اس لیے اسے جس طرح بھی ہوا یہ اذیت برداشت کرنی پڑی، اور روانہ ہو گیا۔ وہ اکثر خاموش رہتا تھا، مگر روانگی کے وقت اس کی خاموشی، اور افسردگی نے زاہدہ کو بہت ہی پریشان کیا، لیکن وہ خاموش تھی، اور کچھ کہہ نہ سکتی تھی۔ جب چلنے کا وقت آ گیا تو صمصام، یہ کہہ کر روانہ ہو گیا۔

"نوکری کے سلسلہ میں یہ دقتیں کچھ زیادہ تکلیف دہ نہ ہوتیں، اگر تمہارے دل میں میری مسرت کی کچھ بھی قدر ہوتی!!"

صمصام چلا گیا تو زاہدہ سوچنے لگی، کہ بے شک میں غلطی پر ہوں۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں، کہ دن بھر کی محنت، اور مصیبت سے فارغ ہو کر جب صمصام، گھر میں داخل ہو تو وہ حق رکھتا ہے۔ کہ میں نہایت خندہ پیشانی، اور فراخدلی سے اس کے استقبال کو آگے بڑھوں، اور اس طرح اس کی تمام کوفت ختم ہو جائے، گھر اس کی بیرونی تکالیف کا جوش

گھر کے واسطے اُٹھا رہا ہے، نعم البدل ہو، اور میں اس کے واسطے مکمل راحت،"

(۴)

تیرہویں روز صمصام، کا خط آیا، کہ "تحصیلداری کے واسطے دوسرا شخص نام زد ہو گیا، اور مجھ کو اس کا جس قدر صدمہ ہوا ہے۔ میں بیان نہیں کر سکتا، میں نے دس روز کی چھٹی لی ہے۔ اور پرسوں شام کو گھر پہنچوں گا۔"

تحصیلداری کی توقعات میں ناکامی ہو کر صمصام، مختلف خیالات میں ڈوب گیا تھا، کبھی سوچتا تھا، کہ تبادلہ کی درخواست کروں، غرض ان ہی تفکرات میں غلطاں پیچاں گھر میں داخل ہوا تو اس کی نگاہ سب سے پہلے زہرہ پر پڑی تو کیا دیکھتا ہے۔ کہ زہرہ ساڑی باندھے، پمپ پہنے، اس کے استقبال کو چبوترہ پر کھڑی ہے، اس نے زبان سے تو کچھ نہ کہا۔ مگر اس نے یہ دیکھ لیا، کہ تعجب کی مسکراہٹ صمصام کے ہونٹوں پر موجود ہے۔ اس وقت اس کو یاد بھی نہ رہا کہ کیا سوچتا چلا تھا، اور کیا خیال کرتا گھر میں داخل ہوا، اب البتہ زہرہ کو معلوم ہوا، کہ

صمصام، کی ہر خوشی زہرہ کے ہاتھ میں ہے۔

عصمت ۔ ۱۹۲۳ء

۱۵ نومبر ۱۹۱۲ء

ڈیر شاد بانو بیگم۔

اگرچہ تم میرے نام سے واقف نہیں ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم میری صورت بھی بھول گئی
ہو۔ لیکن تمہاری مرنے والی ماں، میری وہ شاگرد تھی جس پر میں آج تک فخر کرتی ہوں۔ اور
جب تک زندہ ہوں اُس بے نظیر عورت کی موت پر افسوس کروں گی۔ اسی تعلق کی بنا پر مجھے
اس خط کے لکھنے کا ہر حق حاصل ہے۔ میں نے تم کو تمہاری ماں نواب نصیرہ بیگم کی گود
میں سب سے پہلے چار دن کا دیکھا، اور اس کے بعد اُن کے ساتھ تقریباً پانچ برس کا جب میں
حیدرآباد سے مدراس تبدیل ہو کر آئی، تم کو شاید یہ معلوم ہو کر اور بھی زیادہ خوشی ہو گی۔ کہ
ہندوستان میں میں نے اپنی تمام عمر میں صرف دو ہی ایسے شاگرد پیدا کیے جن کو آخری وقت
بھی فراموش نہ کروں گی۔ جوانی میں تمہاری ماں اور بڑھاپے میں وہ لڑکی جو اسی مہینے کی [illegible]
تاریخ کو بھاوج بن کر تمہارے محل میں داخل ہوئی ہے۔ تم کو یہ سنکر افسوس ہو گا کہ اور مجھے
امید ہے کہ تم کو اگر ناگوار ہو گا تو معاف کرو گی کہ مجھے تمہارے اُن تعلقات کا حال معلوم کر کے
جو تمہاری نئی بھاوج سے ہیں رنج ہوا۔ مجھے تعجب ہے کہ ایسی مہذب اور انسان ماں کی
بیٹی اس درجہ کج خلق ہو کہ دیکھنے والے بھی محسوس کریں۔ تمہاری بھاوج تہذیب
اور انسانیت کا پورا نمونہ ہے اور یقیناً ماں باپ نے یہ ظلم کیا۔ کہ وہ یہ نہ جان سکے
کہ وہ بیٹی کی شادی نہیں کر رہے بلکہ ایک بے گناہ روح کو تم جیسی ظالم نند کے قبضے میں

دے رہے ہیں۔ تمہارے ان تمام حالات کا علم مجھ کو اپنی ایک دوست سے معلوم ہوا ہے۔ جس کے علاج میں تم تین چار روز رہیں۔ تم اس بات کا یقین کرو کہ تمہاری زبانیوں کا علم قیصری کے ماں باپ کو بالکل نہیں ہے۔

میں نہایت ممنون ہوں گی، اگر تم میری ان چند سطروں پر توجہ کرو گی۔

میں ہوں تمہاری صادق
(ای۔ موردس)

(۱)

خط کیا ایک شتابہ تھا جس نے دلشاد کے بارود مزاج میں آگ لگا دی۔ قیصری اپنے کمرہ میں تنہا بیٹھی المناهس! پڑھ رہی تھی۔ کہ دفعتہً دلشاد بھوکے کی طرح اٹھی، بادل کی طرح کڑکی، اور بجلی کی طرح آکر گری۔ غصہ کیا، ایک خدا کا قہر تھا۔ آٹھ دس خواصیں اور لونڈیاں تھر تھر کانپ رہی تھیں۔

قیصری بدنصیب جس نے اس سے پہلے ایسا تماشا کبھی نہ دیکھا تھا تعجب سے ننداکا منہ دیکھ رہی تھی۔ بالآخر اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا "آپا جان میں نے یہاں آنے کے بعد مس موردس کو ایک بھی خط نہیں لکھا آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے"۔ اتنا سنتے ہی دلشاد آپے سے باہر ہوگئی چاروں طرف ناچی اور جو کچھ منہ میں آیا بھاوج کو سناتی پھری۔ قیصری اگر کسی بات کا جواب دیتی تھی، تو بات ختم ہونے سے پہلے خواصوں کی متفقہ صدا لگتی "جھوٹ! جھوٹ!! جھوٹ!!!"

۲

جمشید محل کے پائیں باغ میں دلشاد یا نو بیگم گلاب کی روشوں پر ٹہل رہی ہے۔ صورت کے اعتبار سے وہ خاصی بدصورت عورت ہے۔ رنگ حبشیوں سے کچھ بہتر ہے۔ آنکھیں دوسری چیز کو دیکھ سکتی ہیں، مگر خود مشکل سے نظر آتی ہیں۔ بال ہیں تو سیاہ مگر ٹھوں سے بھی کم۔ پیچھے پیچھے ایک بڈھے پھونس سے سیٹھ "بیگم صاحبہ" کہتے ہوئے ساتھ پھر رہے ہیں۔ دفعتاً سیٹھ جی نے اپنی تو ند پر ہاتھ پھیر کر کہا "بیگم صاحبہ جی ہم اب نہیں چل سکتا، اس گھاس میں بیٹھو اور ہم کو وہی غزل سناؤ"

بیگم۔ "اِس سرو کے درخت تک چلو!"
سیٹھ جی۔ "آج تم نے گولیاں بہت کھلا دیں۔ بے حد ڈکار آتا ہے۔ بیٹھو۔
غزل بولو۔ وہی' وہی' داغ کا' داغ کا"
بیگم۔ "یہ سامنے کون آ رہا ہے۔ اظہر ہے"۔
سیٹھ جی۔ "تمہارا بھائی اظہر ہم کو بہت محبت کرتا ہے۔ مگر وہ اُلّو کا پٹھا ہے!"
بیگم۔ "تم بغیر سوچے سمجھے کیا کہہ دیا کرتے ہو۔ مجھ سے ایسی باتیں مت کیا کرو!"
سیٹھ۔ "برا مت مانو وہ اُلّو اُس کا باپ اُلّو۔ بیوی سے لڑتا، بیشک اُلّو، اچھا ہم جاتا ہے تم بات کرو"
رشاد بانو بیگم۔ کا خاوند سیٹھ چلا گیا۔ رشاد بانو بیگم اپنے بھائی سے ملی، اور
دونوں بہن بھائی حوض کے کنارے پر جا پہنچے۔
بہن۔ "مجھے تمہاری زندگی کی بربادی پر افسوس ہے۔ خدا دشمن کو بھی ایسی پڑھی لکھی بیوی
نہ دے، اتا جان نے بھی کبھی ہمارے والد کو خوش نہ رکھا۔ وہ بھی علم کے گھمنڈ میں رہیں۔
میں سمجھتی ہوں تم اس کو طلاق دو، دوسری بیوی کرو!"
بھائی۔ آپا وہ فرمانبردار ضرور ہے۔ مگر اپنے مزاج سے مجبور ہے۔ بلا ضرورت بات نہیں کرتی
اخبار ضرور پڑھتی ہے۔ اور خواہ اپنا سر نہ گوندھے مگر کمرے کو روزانہ دلہن بنا دیتی ہے
اگر تمہاری بھی خوشی ہے تو میں اس کو طلاق دے دوں گا، یا بغیر طلاق دیئے دوسرا نکاح
کرلوں گا۔ وہ عمر بھر پڑی سڑا کرے گی۔ پھر معاف کردے گی تو طلاق دے دوں گا۔ نماز
کا وقت ہو گیا ہے۔ اب میں جاتا ہوں"
اظہر یہ کہہ کر باغ سے باہر آیا۔ اس کا سر منڈھا ہوا تھا۔ ٹخنوں سے اونچا پاجامہ تھا۔ اور
وظیفوں کی کثرت نے اس کا دل سخت کر دیا تھا۔ مسجد میں نماز پڑھی۔ پانچ چیر کر گڑگڑا
گڑگڑا تار ہا۔ اور تسبیح پھیرتا ہوا گھر چلا گیا۔

(۳)

یہی جمشید محل ہے اور وسطی کمرہ میں رشاد اپنی مسہری پہ مغموم اور متفکر لیٹی ہوئی ہے۔ ایک

خواص پاؤں دبا رہی ہو۔ دفعتاً رشاد گھبرا کر اُٹھی اور بآواز بلند کہا "میں اپنی جانی دشمن اس کم بخت بھاوج قیصر کو اگر در در کی بھیک نہ منگوادوں تو میرا نام رشاد نہیں"۔ ابھی یہ فقرہ ختم نہیں ہوا تھا کہ سیٹھ جی کمرے میں داخل ہوئے اور آرام کرسی پر یہ کہتے ہوئے لیٹے "بیگمہ تمہاری بھاوج پھول ہے اور بھائی اُلّو۔ گدھا"

رشاد۔ "وہ ایک بیہودہ عورت ہے۔ تم کیوں اس کی تعریف میرے سامنے کرتے ہو؟

سیٹھ:۔ "بیگمہ، بہینگ بھی بڑا اچھا چیز ہے۔ ہم پسند کرتا ہے۔ مولی سے اچھا ہے، ہاں ہاں تمہارا بھائی اظہر بڑا گدھا ہے" میاں بیوی کی باتیں ہو رہی تھیں، ایک ماما داخل ہوئی اور ایک خط ایک چھوٹے سے بکس کے ساتھ سیٹھ جی کو دیا۔

سیٹھ۔ "بیگمہ۔ آپ یہ چٹھی پڑھو، دیکھو اس بکس میں کیا ہے"۔ رشاد۔ (خط کو چاک کر کے)

مکرمی سیٹھ صاحب:۔

میں ممنون ہوں کہ آپ نے مجھ ناچیز کی بابت ایسی اچھی رائے کا اظہار فرمایا۔ آپ کی عطا کی ہوئی انگوٹھی آپ کی محبت کی ایسی یادگار ہے کہ میں کبھی نہیں بھول سکتی، میرا دلی شکریہ قبول فرمائیے۔ آپ نے جس رومال کی تعریف کی تھی نہایت ادب سے روانہ خدمت کرتی ہوں۔ یہ حقیر تحفہ آپ کے قابل نہیں ہے لیکن لیکن آپ قبول فرما لیجیے، تو آپ کی ذرّہ نوازی ہے۔

آپ کی کنیز
قیصر

(۴)

اظہر اور قیصر، دونوں میاں بیوی آمنے سامنے کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں، قیصر اپنی غلطی پر نادم ہے مگر اظہر کا غصہ کسی طرح فرو نہیں ہوتا۔

اظہر۔ "بے شک تو بدکردار ہے۔ مجھ کو اگر ایسا ہی کرنا تھا تو مدراس چلی جاتی، نہ کہ حیدرآباد میں میرے تمام خاندان کی ناک کٹوادی۔ تیرا ثبوت میرے ہاتھ میں یہ تیری اپنی تحریر ہے تو نے سیٹھ صاحب کی انگوٹھی قبول کی، اور بدلے میں اپنا رومال بھیجا۔ اس سے زیادہ تو کیا کر سکتی تھی۔ میں اب تیری صورت دیکھنی نہیں چاہتا"

قیصر "بے شک وہ آپ کی عدم موجودگی میں آئے۔ اور صرف اس خیال سے کہ آپا جان ناراض نہوں میں نے اُن کو اندر بلا لیا۔ یہ خلافِ تہذیب تھا کہ میں اُن کی دی ہوئی انگوٹھی واپس کر دیتی۔ رومال میں نے آپ کی اجازت سے بھیجا ہے۔ بظاہر مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔"

اظہر "مجھ کو ان بھیدوں کا حال کیا معلوم۔ بس زیادہ باتیں بنانے کی ضرورت نہیں میں اس وقت کے بعد تیری صورت نہ دیکھوں گا۔"

(۵)

آدھی رات کا سنسان وقت ہے، اور وہ قیصر جس کے ایک ادنےٰ سے اشارہ پر اب بھی ماں باپ اشرفیاں قربان کرنے کو موجود ہیں، اندھیرے گُپ میں جانماز پر بیٹھی ہوئی ہے۔ نماز پڑھ چکی، اور پھر ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگی جس میں عاقبت کی سلامتی، اور اظہر کی درازیٔ عمر کی التجا شامل تھی۔ اس کے بعد ایک ٹوٹے سے کھٹولے پر آ کر لیٹ گئی۔ اور دل ہی دل سے اس طرح باتیں کرنی شروع کیں۔

"خدا شاہد ہے اگر میرے دل میں ذرہ بھر بھی بُرائی ہو میں بے گناہی کا شکار ہوئی، اور آج اس قابل ہوں کہ میرے گھر میں جلانے کا تیل بھی میسّر نہیں" قیصر یہ کہہ کر اُٹھی تین بج چکے تھے ہجوم افکار نے زیادہ پریشان کیا، مگر مستقل مزاج ماں کی بچی نے ضبط کو ہاتھ سے نہ دیا۔ کمرے میں گئی تسبیح لائی اور اس وقت پڑھتی رہی جب تک کہ موذن نے روزِ روشن کی آمد کی اطلاع نہ دی۔

(۶)

مس موڈس، اور قیصر کے ماں باپ تینوں آدمی قیصر کو سمجھا رہے ہیں کہ وہ اُن کے ساتھ مدراس روانہ ہو جائے مگر قیصر کی خاموشی سے بہت پریشان ہیں، بالآخر مس موڈس نے کہا "پیاری قیصر، اگر تم اپنی جان کی دشمن ہو تو تم کو اختیار ہے، ورنہ عقلِ سلیم ہرگز روا نہیں رکھتی کہ تم ایسے وحشی شوہر کی فرمانبرداری کرو"

قیصر "مس صاحب! میں مسلمان ہوں، خدا اسلام پر میرا خاتمہ کرے۔ والدین نے

جس شخص کے ہاتھ میں میرا ہاتھ دے دیا، جیسا کچھ بھی ہو میرے سر کا سرتاج ہے۔ میرا فرض ہے، کہ میں اس کی فرمانبرداری کروں۔ آپ یقین سمجھیئے میں اپنے شوہر کی بغیر اجازت اس گھر سے باہر قدم نہ نکالوں گی۔"

تینوں آدمی قیصر پر لعنت بھیجتے ہوئے چلے گئے، اور وہ بدنصیب حسرت سے سب کا منہ تکتی رہی۔ دوپہر ڈھل چکی تھی قیصر کچھ دیر تک اپنی حالت زار پر آنسو بہاتی رہی، اور اس کے بعد قلم دوات لے کر اس طرح لکھنے بیٹھی۔

میرے سرتاج۔

میں گنہ گار ہوں میرا قصور معاف کیجئے مجھ کو اس ڈھنڈار گھر میں جہاں آدمی ہے، نہ آدم زاد بلکہ بعض دفعہ جلانے کا تیل تک میسر نہیں، رات بھر ڈر لگتا ہے۔ اگر آپ اتنا انتظام کر دیں، کہ ایک عورت صرف رات کو یہاں سو رہا کرے، تو آپ کا احسان عمر بھر نہ بھولوں گی..........

قیصر یہیں تک لکھنے پائی تھی کہ اس نے دروازے میں کسی کی آہٹ سنی۔ آنکھ اٹھا کر دیکھتی ہے تو اظہر، نہایت بشاش چلا آ رہا ہے۔ اس نے آتے ہی خلاف عادت قیصر سے ہاتھ ملایا۔ اور کہا "کل صبح آپا جان کے یہاں تمہاری دعوت ہے تم اس کو منظور کرو میں تمہارے ساتھ شریک ہوں گا۔ اور امید ہے کہ پچھلی شکایتیں سب رفع ہو جائیں گی۔"

قیصر۔ مجھ کو کیا عذر ہو سکتا ہے۔ میں تو فرمانبردار ہوں آپ جس وقت تشریف لائیں میں نہایت خوشی سے چلوں گی

۷

جمشید محل کی بارہ دری میں رشاد تیوری پر بل ڈالے ہوئے چاروں طرف پھر رہی ہے۔ ایک عورت اس کے پیچھے پیچھے ہے، اور دونوں بالکل خاموش ہیں، کہ دفعتاً رشاد نے اس عورت کی طرف دیکھا اور کہا "میں اس کم بخت بھاوج کی زندگی کا خاتمہ کرتی ہوں۔ جو میرا ہی گھر اجاڑنے کی فکر میں ہوئی۔ کیا اسی کا نام تعلیم اور تہذیب ہے خدا ایسی

عورتوں کی صورت نہ دکھائے۔ میں آج پندرہ دن سے دیکھ رہی ہوں، کہ سیٹھ صاحب مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔ ہر وقت وہ رومال اُن کے ہاتھ میں ہے۔ اور اسی کم بخت کا ذکر ہے۔"

یہی باتیں ہو رہی تھیں، کہ اظہر، اور قیصرہ، سامنے سے آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ قیصرہ کے گلاب سے رخسار، گو متواتر افکار سے مرجھا چکے تھے۔ مگر آج ان میں کچھ تازگی نظر آتی تھی، شاد بھائی بھاوج کی صورت دیکھتے ہی بے تابانہ دوڑی کمرے میں لاکر بٹھایا، دسترخوان چھپنے کا حکم دیا، اور تینوں آدمی کھانے میں شریک ہوئے، مشکل سے تین چار ہی نوالے قیصرہ کے حلق سے اترے ہوں گے، کہ وہ گھبرا کر اُٹھی چکر آیا، گری، سنبھلی، اور سامنے کوچ پر لیٹ گئی۔

زہر اپنا کام کر چکا تھا، پاؤں کانپنے لگے، اسی حالت میں وہ اُٹھی لڑکھڑاتی ہوئی شوہر کے قدموں میں گری، پاؤں کو بوسہ دیا۔ اور کہا، "میں بدنصیب نہیں، خوش قسمت ہوں، اس لئے کہ تمہارے ہاتھ سے پیوند زمین ہوں گی۔"

"اس کے بعد قیصرہ سے بات نہیں کی گئی، اور وہ تڑپتی ہوئی اس فانی دُنیا سے رخصت ہوئی۔

۸

چودھویں رات کا چاند قیصرہ کی قبر پر چھَن چھَن کر چاندنی ڈال رہا ہے۔ سرسبز و شاداب گملے چاروں طرف رکھے ہوئے ہیں۔ بیلیں چھائی ہوئی ہیں۔ اور مدراسن قیصرہ جو باپ دادا کی لاج رکھ گئی، ہزاروں من مٹی کے نیچے میٹھی نیند سو رہی ہے۔ ہوا سر سرا کر گلاب کے پھولوں کو چھیڑ رہی ہے۔ اور اس گورستان میں جہاں کوسوں انسان کی آواز کا پتہ نہیں۔ املی کے تناور درختوں کی ٹہنیاں اس آسمانی حور پر آنسو گرا رہی ہیں۔ اور بآواز بلند کہہ رہی ہیں۔ "ہندوستان کے مسلمانو، آؤ اور اپنے تمدن پر نظر ڈالو، یہ بےکس و مظلوم

بچی جو ہندو کے مظالم کا شکار ہوئی، آخری وقت میں بھی اپنی عزت اور باپ دادا کی لاج کا پتہ دے رہی ہے۔ "دُنیائے فانی کہیں سے کہیں پہنچ جائے۔ صدیاں ختم ہوں، سال بیتیں، مگر یہ سرسبز و شاداب بیلیں جو آج مظلوم قیصری کی قبر کو چھپائے ہوئے ہیں ہرگز نہ مرجھائیں گی، اور ان بیلوں کی ہر پتی، پھول کی ہر پنکھڑی، اور اس قبر کا ہر کونا مسلمان ہندوؤں کے ظلم کا پتہ دیتا رہے گا۔

عصمت ۱۶ ستمبر ۱۹ء

امینہ بنت اظہر

جب زمانہ سلطنت اسماعیلیہ کا چراغ گل کر چکا اور احمد بن عبداللہؒ کی حکومت کا ڈنکا چاروں کھونٹ بج گیا تو ایک روز جبکہ احمد کو حکومت کرتے ہوئے پانچواں سال تھا امینہ بنت اظہر جو بادشاہ بیگم تھی اپنے محل میں بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ بے شمار کنیزیں اس کے سامنے دست بستہ کھڑی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی حکم کا انتظار کر رہی ہیں۔ دفعتاً وہ اپنی زر نگار مسہری سے اٹھی اور قصر احمد میں آئی۔ بیسیوں لونڈیاں اس کے جلو میں موجود تھیں۔ اور ہر قدم پر دعاؤں کے نعرے آسمان تک بلند ہو رہے تھے۔ چند لمحہ روشوں پر ٹہل کر وہ باغ سے باہر نکلی۔ دریائے ضمور زور شور سے لہریں لے رہا تھا۔ آگے بڑھی اور کنارہ دریا پر پہنچ کر ٹھیر گئی۔ یہاں اس نے جھونپڑی دیکھی جس میں ایک عورت اپنے دو بچوں کو لیے ہوئے پانی کی رفتار کو دیکھ رہی تھی۔ ملکہ آگے بڑھی اور جھونپڑی کے پاس پہنچی دیکھتی کیا ہے کہ ایک حسین عورت جس کی عمر بیس اکیس سال سے زیادہ نہ ہوگی چودھویں رات کے چاند کی طرح جگمگا رہی ہے۔ مگر رنج و غم کی سیاہ گھٹا چاند سے چہرے کو گھیرے ہوئے ہے۔ امینہ اس لڑکی کی صورت دیکھ کر

دنگ رہی، اور یہ دیکھ کر کہ اوس نے آداب شاہی کے موافق مجرا کیا۔ اور بھی متعجب ہوئی۔ ان دونو باتوں پر طرہ یہ تھا کہ وہ اپنا فرض ادا کرنے کے بعد لہروں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اور پھر پلٹ کر ملکہ کی طرف نہ دیکھا۔ امینہ یوں ہی ایک غضب ناک عورت تھی۔ اُس پر ملکہ وقت، اور والیٔ سلطنت کی بیگم آپے سے باہر ہو گئی۔ جلتی بھلستی محل کی طرف چلی اور لونڈیوں کو حکم دیا کہ اس گستاخ عورت کو ابھی محل پر حاضر کرو۔

۲

صبح کا سہا وقت ہے۔ امینہ قصر شاہی میں جلوہ افروز ہے غصّے سے چہرہ تمتما رہا ہے۔ لونڈیاں نیچی گردن کیے کھڑی ہیں۔ اور ایک گرفتار عورت جس کے کپڑے میلے چکٹ ہیں سامنے کھڑی ہوئی ہے۔ دو منٹ تک امینہ بالکل خاموش رہی، اور اس کے بعد للکار کر کہا۔

"او کم بخت گستاخ فقیرنی تو آداب شاہی سے واقف تھی۔ مگر میری رعیت ہو کر تو نے نمک حرامی کی۔ اس کی سزا تیری گردن اور جلاد کی تلوار ہو گی۔ اگر تیری کوئی آرزو ہے تو بیان کر"۔

عورت:۔ "امینہ لاریب تو بادشاہ بیگم ہے۔ اور میں ایک مصیبت زدہ بیوہ عورت۔ امینہ میں خاندان اسماعیلیہ کے آخری تاجدار عزیز کی وہ بیٹی ہوں جس کی سالگرہ پر ایک رات میں بارہ لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا۔ امینہ! تو نے رات بھر مجھ کو قید رکھا۔ اور میرے دو نو معصوم لال مجھ سے چھٹوا دیے ہیں۔ گنہگار ضرور ہوں، مگر میرے بچے بے گناہ ہیں، اور قیامت کے روز وہ تیرا دامن پکڑیں گے"۔

امینہ:۔ "او کم بخت عورت تو آج تک زندہ ہے۔ اور تیرے جفا کار بچے

تاج و تخت کا دعوےٰ کرنے کے واسطے موجود ہیں۔ میں تجھ سے پہلے۔ اون کو بلا کر قتل کرتی ہوں۔ کہ یہ فتنہ ہمیشہ کو فرو ہو جائے!!

۳

تاریخ آج تک ایسے ظالم عورت کی زندگی پر خون کے آنسو گرا رہی ہے۔ جس نے ایک ماں کے سامنے اُس کے دونو بچے قتل کرا دیئے اور اُس کی آنکھیں نکلوا کر اُس کو زندہ چھوڑ دیا۔

اس واقعہ کو چھ ماہ بھی نہ ہوئے تھے کہ احمد بن عبداللہ گھوڑے سے گر کر انتقال کر گیا۔ اور اُس کا بڑا بیٹا محمد ابن احمد تخت نشین ہوا۔ جس کا پہلا کام یہ تھا کہ اُس نے سوتیلی ماں کو قیدخانہ میں بھیج دیا۔ جہاں وہ تین برس زندہ رہی، اور پھر آخر سر پٹک پٹک کر مر گئی۔

بظاہر محمد کا یہ فعل ظالمانہ تھا۔ مگر قدرت نے۔ ایک ایسی عورت کو جس نے دوسری مامتا کو نہ پہچانا تھا۔ کافی سزا دی۔ اور یقیناً وہ مائیں جو دوسروں کی مامتا کو مامتا نہ سمجھیں، وہ اس سے بھی بدتر سزا کی مستحق ہیں۔

عصمت۔ ۱۹۱۵ء

عالمِ بالا کی ایک رُوح

جب قدرت کا قانون میری زندگی کو ختم کر چکا، اور دنیا کی زندہ روحوں نے مجھ کو اس ناپائیدار جہاں سے رخصت کیا تو آدھی رات کا سناٹا وقت تھا۔ بہت سے عزیز چاروں طرف سے مجھے گھیرے ہوئے تھے، انگیٹھیاں سُلگ رہی تھیں۔ اور رنگ برنگ کی دوائیاں اپنے جلوے دکھا رہی تھیں، آسمان ساکت تھا، اور میری روح عالمِ بالا کو پرواز کرنے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ دفعتاً ایک غیر معمولی صورت نمودار ہوئی، اور اس کے اشارے سے میرا جسم بے جان ہو گیا۔ روح نکل گئی۔ اور یہ نیا انسان یا فرشتہ جو کچھ بھی تھا، مجھ کو لے کر آسمان پر اُڑا۔ وہاں کی بستی عجیب تھی۔ صرف روحیں تھیں۔ جن کا جسم نہ تھا۔ انسان تھے۔ مگر دنیا جیسے نہ تھے۔ فرشتے تھے۔ حوریں تھیں۔ مگر ایسے جو انسان کے وہم و گمان میں نہ آسکیں۔ تکلیفیں تھیں لیکن الامان۔ راحتیں تھیں سبحان اللہ سبحان اللہ! میرے سامنے میرا اعمال نامہ پیش کیا گیا۔ اور کمال یہ تھا کہ میرا کوئی فعل، یا قول ایسا نہ تھا، جو اس میں نہ ہو۔ عبادت بھی تھی، حسد بھی تھا، رحم بھی تھا، اور غصہ بھی۔ بھلائیاں برائے نام تھیں، اور برائیاں سرتاسر۔ میں گھبرا گئی۔ جب یہ دیکھا، کہ قہرِ خدا کے خوفناک شرارے

اور قادرِ ذوالجلال کی نارضامندی کی تیز لپٹیں مجھے لینے کو دوڑیں۔ عالم تنہائی تھا۔ تحیر تھا۔ سکوت تھا۔ بے بسی تھی۔ بے کسی تھی۔ کوئی یار نہ تھا مددگار نہ تھا۔ ہمسایہ نہ تھا۔ پڑوسی نہ تھا۔ فرشتہ اپنی تیز اور چمکدار آنکھوں سے مجھے گھور رہے تھے۔ اور میں منتظر تھی۔ کہ یہ آسمانی ہیبت کسی وقت میرا خاتمہ کردے کہ میں اس خوف ودہشت سے چھٹکارا پاؤں، آگ کے شعلے میرے پاس تھے، اور قریب تھا کہ مجھ کو جلا دیں، جھلس دیں، خاکِ سیاہ کردیں، کہ ایک نورانی عورت اپنے دو بچے لیئے ہوئے سامنے آئی، فرشتوں پر اس کی حکومت تھی، اور کارخانۂ قدرت میں اس کا ڈنکا بج رہا تھا۔ اس نے خوفناک فرشتہ سے غصہ سے کہا "کیا تونے وہ وقت نہیں دیکھا۔ جب میں تین وقت کے فاقے سے۔ اپنے ان دونوں یتیم بچوں کو لے کر گھر سے باہر نکلی ہوں۔ دُنیا مجھے دھتکار رہی تھی، رئیسوں نے توجہ نہ کی۔ امیروں نے مُنہ پھیر لیا۔ مگر یہی تھی وہ عورت جو خود بھوکی رہی اور میرا پیٹ بھرا،

دُنیا کی روحوں میں سے جو آج تم لائے ہو، اس سے زیادہ رحم و کرم کا مستحق کوئی نہیں۔

غصّہ کی آگ کو بجھادو۔ اور اس کو اس سامنے والے مکان میں پہنچادو۔ جہاں اطمینان اس کی خدمت کرے گا۔ اور راحت اس کی نگہبانی۔

"بیوی! یہی جنت ہے"

عصمت ۱۹۱۶ء

بیوی مسلمان شوہر کی نگاہ میں

پرائی اولاد کے واسطے ایمان نگلنے کی ہم کو ضرورت نہیں۔ مانا کہ زرینہ لکھ پتی باپ کی بیٹی، اور چودہ بچوں میں ایک بچی تھی، مگر ہماری رائے میں اتنی قصوروار وہ بھی ہے۔ کہ ظالم شوہر تھا تو مرتی، اور بھرتی، اور جس در پہ پالکی آئی تھی، اُس چوکھٹ سے جنازہ نکلتا۔ مگر اللہ آمین کی بچی، اور وہ بچی جس نے ماں کی زندگی میں پھول تک بھی نہیں توڑا مشکل تھا کہ بیٹھا رہ بلکہ سولہ گھنٹے پتلی کی طرح پھرے، اور تیوری پر بل تک نہ آئے۔ خیر اُس کا فیصلہ اس روز ہوگا۔ جب ظفر اور زرینہ دونوں میاں بیوی، اپنے سچے دربار میں کھڑے ہوں گے۔ اس وقت ہم کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے۔ ظفر انسان نہیں شیطان تھا، جس نے زرینہ جیسے پھول کو جس کی مہک عالم کو معطر کرتی تھی۔ پاؤں میں روند کر برباد کر دیا، اور چہرے پر بل تک نہ آیا۔ خدا شاہد ہے زرینہ کا باپ بیٹی دینے پر آمادہ نہ تھا مگر جاہل بیوی کے ہاتھوں مجبور تھا۔ جس نے محض اپنی ہٹ کی وجہ سے اپنی ہی نہیں گھر بھر تک کی زندگی تلخ کر رکھی تھی۔ یہ ہی تھی۔ وہ وجہ جس نے آسمانی حور کو انسانی شیطان کے قبضہ میں پہونچا دیا۔ زرینہ، دُلہن تھی تو کیا سمجھ دار لڑکی، بیسیوں حالات دیکھے ہوئے، سینکڑوں سُنے ہوئے، اور ہزاروں پڑھے ہوئے، وہ ہی دن میں تاڑ گئی کہ خصم بدرو

میاں اللہ کے نور رہیں۔ پھر بھی اپنی طرف سے تو بہت کچھ لپٹی رہی، مگر نتیجہ یہ دیکھا کہ خدمت کا صلہ غصّہ اور محبّت کا بدلہ خفگی تو انسان تھی فرشتہ نہ تھی امیدیں ہوئیں ختم، اور طبیعت ہوئی افسردہ، اور دل گیا مر۔ رات بھر اسی اُدھیڑ بُن میں پڑی رہتی۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ برسات کا موسم تھا، اور بیس پچیس دن کے کڑاکے کی دھوپ کے بعد آسمان نے کروٹ لی گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا، آدھی رات کے وقت جب موسلا دھار بارش شروع ہوئی تو اُٹھ کر اپنے کمرہ میں آئی۔ لیمپ روشن کیا۔ مگر یہ دیکھ کر بے چین ہوگئی کہ بڑھیا ساس بیمار نند اور سر کا تاج اندھیرے میں لیٹے ہیں۔ اٹھی وہاں بھی روشنی کا انتظام کیا۔ واپس آ رہی تھی کہ ظفر کے یہ الفاظ کان میں پہونچے۔

"اتنی دیر بعد روشنی کرنے کی ضرورت تھی غارت ہو جائے، وہ بیوی جس کو اتنا خیال بھی نہ ہو۔"

جہاں تک واقعات سے پتہ لگتا ہے۔ سازینہ کو کنوارپنے میں لیمپ جلانا تو درکنار شاید ہاتھ لگانے کی بھی نوبت نہ آئی ہو، مگر جوہرِ شرافت اسی کا نام ہے کہ شریفوں کی بیٹیاں مصیبت اور مفلسی کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرتی رہیں۔ سازینہ اگر خدمت کرتی تھی، اور طعنے سنتی تھی، تو کمال نہ تھا، مگر افسوس یہ ہے۔ نافدر دان نے قدر نہ کی، ورنہ سیدانی تو اس آن کی عورت تھی۔ کہ مصیبت کا پہاڑ بھی ٹوٹ پڑتا تو میاں کے ساتھ اسی حالت میں بسر کر دیتی۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ کم بخت شوہر گھنٹوں کی محبّت دم بھر میں خاک میں ملا دیتا۔ برس ڈیڑھ برس اسی طرح گزر گیا۔ دل ہی دل میں گھٹتی، اور بھڑاس تک نکالنے کا موقع نہ ملتا، متواتر صدمات نے کمر ہمّت توڑ دی، اور بالآخر وہ وقت

آگیا، کہ ہاتھ پاؤں جواب دے بیٹھے، دم بھر کو بھی اٹھتی تو چکر آتے۔ اور گر پڑتی خاوند نے اس کو بہانہ سمجھا، اور میکے بھجوا دیا۔ یہاں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ ڈاکٹر اور حکیم ایک چھوڑ چار چار پانچ پانچ آئے اور گئے مگر شوہر کی بے وفائی کا نشتر سے کلیجے پر ایسا داغ نہ تھا، کہ دواؤں سے جاتا رہتا روز بروز حالت بگڑنے لگی۔ جب زندگی سے قطعاً مایوس ہو گئی تو ماں باپ سے پوشیدہ شوہر کو یہ پیغام بھیجا "میری حالت ردی ہے، تم میرے مجازی خدا ہو، میں پلنگ سے اُٹھنے کے بھی قابل نہیں، تکلیف نہ ہو تو چند لمحہ کے لئے آؤ۔ اور قصور معاف کر جاؤ، تاکہ میں خدائے حقیقی کے حضور میں سرخرو جاؤں"۔ اس پیغام کا اثر سنگ دل شوہر پر جو مسلمان ہونے کا مدعی تھا مطلق نہ ہوا اور اس کے دو تین روز بعد نادیہ[1] ملک عدم کو سدھار گئی

مسلمانوں میں اس قسم کے واقعات شب و روز ہو رہے ہیں، نادیہ کی موت بھی کوئی اچنبہ نہ تھا، مگر افسوس اس بات کا ہے، کہ بدنصیب بیوی ایسے ظالم کا شکار ہوئی۔ جو تعلیم یافتہ کہلاتا تھا۔

مسلمان اگر بُرا نہ مانیں تو ہم علی الاعلان کہیں گے کہ اونہوں نے اپنی خود غرضی کے مقابلہ میں اسلام جیسے پاک مذہب کو بیٹ بھر کر بدنام کیا۔ جس مذہب میں عورت بہترین شئے تسلیم کی گئی تھی۔ آج اُس کے پیرو اُس کو بدترین شئے ثابت کر رہے ہیں۔

سہیلی [1] ۱۹۱۵ء

[1] ۱۹۱۵ء میں حضرت علامہ مغفور نے لڑکیوں کے لئے ہفتہ وار اخبار سہیلی جاری کیا تھا جو ۱۹۱۶ء کی آشفتہ دگی کی وجہ سے بند ہو گیا۔

شادی کی ندامت

آفتاب غروب ہونے کی تیاری کر رہا تھا کہ مسٹر لیبا اپنے گول کمرہ میں داخل ہوا۔ دفتر کے کپڑے بدلے اور منہ ہاتھ دھو کر چائے کی میز پر بیٹھا۔ مسز لیبا جو اپنی عمر کا بڑا حصہ طے کر چکی تھی۔ چائے میں شریک ہوئی۔ پرند اپنی اپنی راگنیوں سے روزِ روشن کو رخصت کر کے شبِ سیاہ کا استقبال کر رہے تھے۔ کہ دفعتاً ایک اجنبی اس کوٹھی کے اندر داخل ہوا اور ایک بند لفافہ دے کر چلا گیا۔ چائے ختم کرنے کے بعد مسز لیبا ایک آرام کرسی پر لیٹا۔ لفافہ چاک کیا خط کو اول سے آخر تک پڑھا اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

"افسوس ادیبویا ہماری زندگی برباد کر گئی۔ عمر بھر کا تمام سرمایہ ایک لڑکی اور وہ بھی اس قدر بے وقوف اور بھولی جس نے ایک مکار کے چکمہ میں آ کر نہ صرف اپنی زندگی کا ناس کیا۔ بلکہ ہم کو بھی زندہ درگور کر دیا لو یہ اسی بدنصیب کا خط ہے"

مسز لیبا "اگر اس کم بخت کی عقل پر پتھر نہ پڑتے تو دنیا اپنے واسطے جنت ہوتی۔ کوئی لمحہ اس کی یاد سے نہیں خالی جاتا۔ اگر وہ دغا باز سٹیمل کے دھوکہ میں نہ آتی تو یقیناً ہنری اس کے پاؤں دھو دھو کر پیتا۔ میں

اپنے تجربہ کی بنا پر کہہ سکتی ہوں کہ ناتجربہ کار لڑکیاں ہرگز اس قابل نہیں ہو سکتیں، کہ والدین کے مقابلہ میں اُن کو شوہر کے انتخاب کا حق دیا جائے۔ اگر آج اولیویا ہماری ہدایت پر عمل کرتی، تو ہماری ہی نہیں اُس کی زندگی بھی پر لطف ہوتی، میرے پاس عینک نہیں۔ تم پڑھو میں سُنتی ہوں۔ وہ تو شاید سکاٹ لینڈ میں تھی"!

مسٹر لیلا رڈ سُنو:-

"ڈیڑھ سال سے قریب ہونے آیا کہ میں اپنی شادی کے معاملہ میں اس غلطی کا اقرار کر چکی ہوں جو مجھ سے سرزد ہوئی۔ میں جس شخص کو لارڈ سمجھی تھی، وہ نہایت چالباز نکلا، اور میری آنکھوں کے سامنے مجھ جیسی چار پانچ زندگیاں برباد کر دیں آج پانچ ہفتے ہوئے کہ اُس نے مجھ کو بےقصور اس قدر مارا کہ بے ہوش ہو گئی۔ جب ہسپتال میں پہونچی، اور آنکھ کھلی تو معلوم ہوا، کہ میری پسلیاں ٹوٹ گئیں ہیں۔ گو مہربان لیڈی ڈاکٹر نے توجہ میں کمی نہیں کی۔ مگر میری حالت روز بروز بدتر ہو رہی ہے۔ اور اس وقت مجھ کو ڈاکٹر نے جواب دے دیا۔ ارمان یہ ہے کہ اس وقت آپ کی صورت دیکھ لوں۔ میں آپ سے چند قدم کے فاصلہ پر وکٹوریا ہسپتال میں پڑی ہوں اگر آپ رحم کریں تو میری اس معصوم بچّی کو جو چھ برس کی جان۔ اور میرے ساتھ ہسپتال میں ہے اپنی پرورش میں لے لیجیے"!

مسز لیلا رڈ گو بیٹی سے اس حد تک ناخوش تھی، کہ اُس کی صورت بھی دیکھنے کی روادار نہ تھی، مگر ممتا نے اُس کو تڑپا دیا۔ ضعیفی کا عالم تھا۔ اور اس میں ہڈیوں کے سوا کچھ باقی نہ تھا۔ اولیویا کی تصویر اس کی آنکھوں میں پھر گئی۔ یہ تحریر ایک نشتر تھا جو اس کے کلیجے میں گھسا۔ اُس نے

ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر گر پڑی۔
مسز لیڈا کی یہ بے ہوشی آخری بے ہوشی تھی جس کے بعد اس کو ہوش نہ آیا وہ چند منٹ تک بیٹی کا نام لے کر تڑپتی رہی، اور اس کے بعد اس کی روح عالم بالا کو پرواز کر گئی۔

۳

اولیویا کے خط کو دو سال سے زیادہ گزر گئے۔ مسٹر لیڈا اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا ہے۔ وہی کوٹھی ہے، اور وہی کمرہ۔ مگر ضعیفی کے ساتھ بے اطمینانی کی جھریاں چہرے پر پڑی ہوئی ہیں۔ صبح صادق کا سہانا وقت ہے، اور بد نصیب لیڈا اپنے خیالات میں غلطاں پیچاں آرام کرسی پر پڑا ہوا ہے۔ وہ بار بار پردہ ہٹا کر دوسرے کمرہ میں جاتا ہے۔ جہاں اس کی محبوبہ بیوی اس عورت کی قد آدم تصویر لگی ہوئی ہے۔ جس نے اپنا آخری سانس اس کمرہ میں ختم کیا تھا حسرت بھری نظروں سے اس تصویر کو دیکھتا ہے۔ اور گو زبان سے کچھ نہیں کہتا مگر آنکھیں کہہ رہی ہیں کہ۔
"اے ہمراز عورت کوشش کر کہ آسمانی شاہنشاہ مجھ کو تجھ سے ملا دے"
دفعۃً ایک حسین عورت کمرہ میں داخل ہوئی۔ ضعیف العمر لیڈا کے پاؤں میں گری۔ ایک معصوم بچی اس کے ساتھ تھی تھوڑی دیر بعد اس نے اپنا سر اٹھایا۔ اور کہا
"میں وہ بد نصیب اولیویا ہوں جس نے ماں باپ کی تجویز سے اتفاق نہ کیا اور اپنی مرضی کا شوہر ڈھونڈھ کر کتے سے بدتر زندگی بسر کی۔ ابا جان میں آج سہاگن نہیں بیوہ ہوں، اور یتیم بچی محض آپ کے

رحم کی اُمیدوار ہے۔ اجازت دیجئے تاکہ میں اماجان کے بھی قدموں میں
گرکر اپنا قصور معاف کراؤں"
مسٹر لیبس کی آنکھ میں آنسو بھر آئے شفقت پدری نے جوش
کیا بیٹی کو گلے لگایا۔ بچی کو پیار کیا۔ اور کہا،
"آہ اولیویا۔ تیری بدنصیب ماں تیری یاد میں تڑپتی ہوئی دنیا سے
رخصت ہوئی"
یہ کہہ کر مسٹر لیبس نے پردہ اٹھایا مری ہوئی ماں کی تصویر اولیویا
کے سامنے تھی جس کو دیکھ کر اُس نے ایک چیخ ماری، اور قدموں
میں گر پڑی۔
ستمبر ۱۴ء کے اس واقعہ کے بعد آج تک انگریزی قوم کی
ایک جماعت اس بات کی کوشش کر رہی ہے۔ کہ شوہر کے انتخاب میں
والدین کی رائے مقدم سمجھی جائے۔

عصمت ۱۸ء

وسیمہ، دو بچوں کی ماں، چھ برس کی سہاگن، اور پانچ برس کی گھر بتن برتن تھی۔ وہ ہماری ہمدردی کی مستحق اس لئے ہے کہ بدنصیب ایک ظالم شوہر کا شکار ہوئی۔ اس کی جو پار اُتار کر بھی شرمسار نہ ہوا۔ خاصی اچھی طرح بات ٹھہر چکی تھی۔ حد یہ ہے کہ تعین تاریخ تک ہو گیا۔ احمد یار خان تعلقہ دار باسٹھ ۶۲ ہزار کا مال گذار آدھا علاقہ لکھنے کو تیار، ماں ہر چند نشیب و فراز کا اظہار اور سہیلیاں لاکھ اصرار کر رہی ہیں۔ مگر بھولی بچی "جفا کار انتصار" کے خط کو بار بار دہراتی ہے، اور کہتی ہے "چچازاد بھائی، بچپن کا ساتھی، دھوکا دینے کی ضرورت کیا۔ میں اس کا خون اپنے سر کیوں لوں، مگر میں کیا کر سکتی ہوں۔ اماں جان سے کیا کہوں، کیونکر کہوں، کیسی محبّت کا خط ہے۔ ایک ایک حرف سے خلوص ٹپک رہا ہے!"

وسیمہ بیگم!

جو ارمان ہمیشہ دل میں رہا، اور کبھی زبان پر نہ آیا آج تمہارے ہاتھوں برباد ہوتا ہے، زندگی کی تمام امیدیں جو اب تک لہلہاتی رہیں، اب تم پر قربان ہوتی ہیں۔ جس تصویر کو عالم خیال میں رات دن کلیجہ سے لگائے رہا

وہ مجھ سے منھ پھیرتی ہے۔
وسیمہ بیگم تم کو نہیں معلوم، کہ یہ تین چار سال میرے کس طرح بسر ہوئے کیسی کیسی آرزوؤں میں راتیں صبح اور دن شام کیئے ہیں۔ مجھے تمہارے دربار سے اس سزا کی امید نہ تھی، اب اتنی التجا ہے، کہ، اپنے ہاتھ سے میرا خاتمہ کرو۔
وسیمہ بیگم! میں اوس وقت کے واسطے زندہ نہ رہا تھا، کہ میری آنکھیں تم کو غیر کی ملکیت دیکھیں، اور میں زندہ رہوں، میں بیوہ ما کا بیٹا ضرور ہوں۔ مگر میرے پہلو میں وہ دل ہے۔ جو ہمیشہ تمہاری پرستش کرے، خلوص کی ایسی دولت سے مالا مال ہوں جس کو کبھی زوال نہیں یا قسمت یا نصیب! آخری کوشش یہ ہے کہ چچی جان سے درخواست کرتا ہوں اگر اس وقت تم بھی رحم کرو تو مردے کو زندہ کر دیا ورنہ، میرا آخری سلام قبول کرو!
اس خط کا اثر اندرونی طور پر کیا ہوا، اس کا علم تو خدا کو ہے۔ بہ ظاہر وسیمہ بیگم، انتصار کے نکاح میں آگئیں۔

وسیمہ کی اس زندگی کا ہر حرف، اور ہر واقعہ اس قدر دردانگیز، و جگر خراش ہے، کہ اس کے بیان سے تکلیف ہوتی ہے۔ انتصار طوطے کی طرح دیدے بدل گیا۔ بمشکل سے چھ مہینہ گذرے ہوں گے، کہ ظالم نے رات دن مردانے میں رہنا شروع کر دیا۔ ایک دو ہی برس کے اُلٹ پھیر میں وسیمہ اس قابل ہوگئی، کہ بچے پاس ہوتے۔ اکیلا گھر ہوتا، اور گھنٹوں گُم سُم بیٹھی رہتی۔ مفلسی ہو یا تونگری قدرت کو اپنے کام سے کام ہے۔ چھ سال تک کوئی برس ایسا نہ گذرا کہ ایک نئی روح مصیبت بن کر بدنصیب پر نازل نہ ہوئی ہو۔ انتصار نے کی لاپروائی، ماں باپ ہوئے راہی، بہن تھی نہ بھائی۔ ہجوم افکار نے پے درپے،

صدمات نے دو سال کی بیمار کو زندگی سے بیزار کر دیا۔ جب نوبت یہاں تک پہونچی کہ انتصار کو آٹھ آٹھ دن گھر میں آنا قسم ہو گیا، تو ایک روز آدھی رات کے وقت جب ابرِ سیاہ گھرا ہوا تھا۔ بجلی زور شور سے چمکنی شروع ہوئی۔ مینھ کم تھا، مگر بادل کی کڑک کلیجہ دہلا رہی تھی۔ وسیمہ پر کچھ ایسی دہشت طاری ہوئی، کہ وہ سب بچوں کو اندر کے دالان میں لے گھس گئی۔ کانوں میں انگلیاں دیں، آنکھیں بند کر لیں، مگر دہشت کسی طرح کم نہ ہوئی۔ کہیں صبح کے قریب جا کر جب مؤذن اذان دے رہا تھا۔ آسمان نے رنگ بدلا۔ باہر آئی وضو کیا نماز پڑھی اور انتصار کو یہ خط لکھا۔

میرے آقا!

محبت کے وعدے، اور نباہ کا اقرار کہاں گیا! میں تو سدا ہی کی بدنصیب تھی، مگر تمہاری ذات سے اُمید تھی، کہ دکھیاری پر رحم کرو گے۔ تم نے بیوی تو کیا اپنے بچوں کی ماں بھی نہ سمجھا دُنیا کی بہار، اور زندگی کا عیش مجھ پر حرام ہو گیا۔ کیسی کیسی مصیبتیں گذر گئیں مگر تم نے بات تک نہ پوچھی۔ جس شکل کی پرستش پر تیار تھے، آج وہ زہر ہے۔ خدارا کوئی خطا یا قصور تو بتاؤ۔ صورت دیکھی بھالی، اور مزاج جانا بوجھا تھا۔ پھر ایسا کیا غضب ٹوٹا، کہ بات تک پوچھنی گناہ ہو گئی۔ مجھے شکایت نہیں، میرا کچھ زور نہیں۔ رحم کی امیدوار ہوں، وہ بھی صرف اس لیئے کہ زندگی کی امید نہیں، خدا کے ہاں سرخرو جاؤں۔

تمدن سنہ ۱۹۱۴ء

انتظار

دوست ہو یا دشمن بیوی ہو یا ماں بہن، ہر عزیز کی موت پر افسوس ہوتا ہے، مانہ کہ بیوی جو دنیا میں بہترین رفیق اور سچی مددگار ہے، بہت کم ہوں گے ایسے شوہر جنھوں نے مرنے والی بیویوں کی یاد دل سے بھلا ئی ہو، اور ان سے بھی کم وہ ہوں گے جن کو بیویوں کے مرنے کی مسرت حاصل ہوئی ہو۔ کاش میں ولیم یا رچرڈ دونوں میں سے ایک ہوتا۔ میری مرنے والی بی بی جوان فانی صورتوں میں ایک فرشتہ تھی، میرے دل پر وہ داغ چھوڑ گئی ہے۔ جس کو نکلنے اور ڈوبنے والا سورج چمکنے اور ماند ہونے والا چاند ہر وقت تازہ کرتا رہتا ہے۔ میں باغوں میں جاتا ہوں۔ مگر کھلنے والی کلیاں میرے دل کو داغ دیتی ہیں اور پہاڑ پر پہنچتا ہوں۔ پھر میں مصیبت کا پہاڑ بن کر میرے سر پر ٹوٹتی ہیں! جنگل کے خودرو پھول، زمین پر سونے والی سبز گھاس، آسمان پر چمکنے والے تارے ہوا میں اڑنے والے پرندے میری تکلیفوں کو تازہ کرتے ہیں۔ ہوا کے ٹھنڈے جھونکے میرے کان میں داستان مصیبت بیان کرتے ہیں اور سبز پتوں کی سرسراہٹ مجھ کو دردانگیز نغمہ سناتی ہے۔

میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جن کو ہندوستان یہ کہہ کر تسکین دیتا ہے کہ "بیوی کی موت ہڈی کی چوٹ ہے" جو تھوڑی دیر بعد زایل ہو جاتی ہے

بلکہ یورپ کی سرزمین کا رہنے والا ہوں جس نے اسلام کی تعلیم کے موافق عورت سے محبت کی۔ اور اپنی رائے میں انسانیت کا فرض ادا کیا یعنی بیوی کی پرستش کی۔

میرا باپ لارڈ سیکسن اُن ممتاز لوگوں میں سے تھا جن کے نام آج تک تاریخ میں نظر آ رہے ہیں۔ میری بیوی میری طرح مالدار نہ تھی۔ وہ صورت شکل کے اعتبار سے اوسط درجے سے کچھ بہتر تھی لیکن ایک متوسط باپ کی بیٹی تھی۔ میں اس کی صورت کا دیوانہ تھا۔ میں نے اُس پر زر و جواہر نثار کیا مگر اس نے میری دولت، عزت، اور وقعت کی بالکل پرواہ نہ کی۔ اس نے مجھ سے کبھی محبت کا برتاؤ نہ کیا۔ میں اس کے بوٹ اپنی آنکھوں سے لگاتا۔ اس کے پاؤں چومتا۔ مگر وہ آنکھ اُٹھا کر بھی میری طرف نہ دیکھتی۔ میرے قصبہ میں مجھ سے زیادہ مالدار آدمی کوئی نہ تھا۔ مگر بیوی کی لاپروائی ایک ایک ایسا صدمہ تھا جس کو میں مدت تک نہ بھول سکا۔ میں "ای تھیسٹ" یعنی دہریہ تھا مجھ کو مسیح پر بالکل اعتقاد نہ تھا۔ مگر وہ ایک پادری کی صحبت میں پلی، اور بڑی ہوئی جس نے اس کو مسیح کا سچا فرماں بردار بنا دیا۔ اس کو جب موقع ملتا تو بجائے اس کے کہ وہ مجھ سے ہنسی خوشی کی باتیں کرتی ہمیشہ مذہب کا ذکر لے بیٹھتی۔

میں اس کی ان ہی باتوں کو غنیمت سمجھتا، اور اس سے کہتا کہ میری پرستش کے واسطے تم ہی کافی ہو۔ مگر وہ اپنی ضد سے باز نہ آتی، اور اس لئے کہ میں دہریہ تھا، میری بات کو غور سے نہ سنتی۔ آہ! اے دُنیا میں تجھ کو کس طرح بتاؤں۔ میں اس کے پاؤں پر سر رکھتا، وہ جھڑک دیتی میں اُس کو سجدہ کرتا وہ ٹھکرا دیتی۔

میں اس وقت چڑے کا کام کر رہا تھا۔ دفعتاً تقدیر نے پلٹا کھایا۔ میرے جہاز ڈوب گئے۔ اور سال ہی بھر میں مجھ پر کئی ڈگریاں ہو گئیں۔ مجھے اب اپنی زندگی وبالِ جان تھی۔ کوئی لمحہ ایسا نہ گذرتا تھا کہ میں اپنی پچھلی حالت کو یاد کر کے حسرت کے آنسو نہ بہاتا ہوں۔ میں نے اپنی حالت کا اظہار اپنی پیاری بیوی ایلینا پر ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ وہ بد دماغ عورت جس نے تمول میں مجھ کو شنہ شہ لگایا۔ مفلسی میں کبھی میری صورت کی بھی روادار نہ ہوگی۔ اگرچہ اس نے میری خاموشی افسردگی دیکھ کر کئی مرتبہ مجھ سے اصلی وجہ دریافت کی۔ مگر میں جانتا تھا کہ جو تھوڑی بہت تسکین مجھے اس کی صورت دیکھ کر ہو جاتی ہے۔ اصلی حال کہہ دینے سے وہ بھی نہ رہیگی افلاس کا اثر میری پیاری بیوی ایلینا پر پڑنے لگا۔ اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ میں اس کی روزمرہ کی ضرورتیں بھی اچھی طرح پوری نہ کر سکتا تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے۔ کہ میری جتنی ایلینا کے چچازاد بھائی کی شادی تھی وہ جب طیار ہو کر چلنے لگی میں نے دیکھا اس کا گاؤن اس سے پیشتر بھی پہنا ہوا تھا۔ اور ایک دامن پر ہلکا سا دھبہ بھی تھا ایلینا نے اس کا بالکل خیال نہ کیا۔ وہ گھر جا سے بہت جلد واپس آگئی مگر اس کی صورت دیکھ کر میرے آنسو نکل پڑے۔ اور تمام رات مجھے اس کا رنج رہا۔ علی الصباح جب میں بر آمدے میں ٹہل رہا تھا۔ مجھ کو ڈاک ملی جس سے معلوم ہوا کہ صرف ایک دوکان جو میری لورپول میں باقی رہ گئی تھی۔ اسمیں آگ لگ گئی۔ اور تمام سرمایہ آگ کی نظر ہو گیا۔

اب میرے پاس ایک پیسہ کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اس خبر کو سنتے ہی میں چکر کھا کر گر پڑا۔ اور اس وقت تک بے ہوش رہا۔ جب تک ایلینا نے آکر

اس خط کو پڑھا اور مجھ کو ہوشیار کیا۔ اس نے مجھ کو تسکین دی، مگر نخوت اب بھی تسکین میں شامل تھی۔ نہایت لاپروائی سے وہ یہ کہہ کر ٹہلنے لگی تعجب ہے، ایک چھوٹے سے نقصان نے تم کو اس قدر پریشان کر دیا میں نے محبت بھری نظروں سے جن میں داستان مصیبت چھپی ہوئی تھی۔ اس کو دیکھا۔ اس نے اس داستان میں سے کچھ سطریں پڑھیں۔ اور سیدھی دفتر کے کمرے میں پہنچی جہاں وہ آج تک نہ گئی تھی۔ آج پہلا روز تھا کہ ایلینا نے میرے حساب کتاب کی پڑتال کی اور اس کو معلوم ہو گیا۔ کہ اب دنیا میں میرے شوہر سے زیادہ کوئی فقیر نہیں ہے۔ میں اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اب ایلینا ایک لمحہ بھی میرے گھر میں نہ ٹھیرے گی، مگر وہ چپ چاپ کر گول کمرہ میں چلی گئی میں اس کو جھانک ہی رہا تھا، کہ ایک شخص نے مجھ کو آکر سلام کیا، اور اطلاع دی کہ "میں عدالت کا یہ حکم لے کر آیا ہوں۔ کہ آپ کا تمام مال و اسباب قرق کیا جاتا ہے۔ آپ تیس منٹ کے اندر اس کوٹھی کو خالی کر دیجئے، اور اپنی بیوی کو لے کر باہر نکل جائیے"

اتنا سنتے ہی ایلینا بھی باہر آگئی، اور سڑک کی طرف روانہ ہو گئی میں اس کے پیچھے پیچھے تھا اس نے مجھ سے بات نہ کی۔ مگر ٹیمز وئیو کے محلہ میں پہنچ کر ایک خالی مکان کرایہ پر لیا، اور مجھ سے صرف اتنا کہا۔

"یہ مکان ہماری موجودہ ضرورتوں کو کافی ہے"

بارہ بج چکے تھے میں ایلینا کو اس گھر میں چھوڑ کر معاش کی تلاش میں نکلا، اور ایک سوداگر کی دوکان پر پہنچا، جہاں میں نے شام تک ساڑھے چھ آنے کی مزدوری کی۔ شام کو میں یہ پیسے لے کر اپنے گھر لوٹا میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ ایلینا کبھی کی غائب ہو چکی ہو گی، مگر اپنے نئے مکان میں قدم

رکھتے ہی کیا دیکھتا ہوں کہ ایلینا ایک خوبصورت دلہن بنی ہوئی جس کے بالوں سے پھول سرگوشیاں کر رہے تھے۔ دروازہ پر میرے استقبال کو کھڑی ہے۔ میری صورت دیکھتے ہی وہ آگے بڑھی میرا ہاتھ ہاتھ میں لیا اور اندر لے جاکر وہ پیانو بجانے لگی جس کی آواز کا میں چار برس سے مشتاق تھا اور جس کے بجانے کے واسطے میں نے اس سے بارہا التجا کی اور اس نے نامنظور کی۔ میں اس کی صورت دیکھ دیکھ کر تعجب کے ساتھ ڈر رہا تھا کہ کہیں یہ ایلینا کی آخری عنایت نہ ہو کہ اس نے باجہ بند کیا اور مجھ سے کہا۔

"میرے سرتاج میں اسی وقت تک تم سے لاپروائی کرتی تھی۔ جب تک تم لارڈ تھے۔ مگر آج جبکہ تم مفلس ہو ایلینا تمہاری لونڈی ہے"

اس نے مجھ کو تمام دنیا کی شفقتیں بھلا دیں، اور میرے ساتھ وہ برتاؤ کیا کہ مجھ کو مفلسی جنت ہو گئی۔ میں ایک پاؤنڈ یعنی ۱۵ روپیہ فی ہفتہ کا ملازم ہو گیا تھا جو مشکل سے ہم دونوں میاں بیوی کی معمولی خوراک کو کافی ہوتا تھا ہم پنیر اور انڈے کی صورت کو ترس گئے، اور مجھ کو زندگی موت سے بدتر تھی، مگر میری پیاری ایلینا قدرت کی ایک ایسی نعمت تھی جس کی محبت و عنایت جس کی تسکین و فرمانبرداری میرے تمام صدموں کو زائل کر دیتی تھی دو سال اسی طرح بسر ہوئے ایک دن کا ذکر ہے کہ ایلینا ایک دعوت میں بلائی گئی، شام کو جب میں گھر آیا ہوں اور ایلینا مجھ کو کھانا کھلا چکی ہے، تو اس نے مجھ سے اس دعوت کا ذکر کیا۔ اور جانے کی اجازت مانگی۔ میں کیا عذر کر سکتا تھا فوراً رضامند ہو گیا۔ مگر ایلینا یہ کہہ کر خاموش ہو گئی کہ۔

"میں اب کسی جگہ شریک ہونا نہیں پسند کرتی، اس لئے نہیں کہ میں

غریب ہوں، بلکہ اس لیئے کہ میں تم کو تنہا نہیں چھوڑنا چاہتی۔"
کیا کوئی شوہر مجھ سے زیادہ خوش نصیب ہو سکتا ہے۔ ہم اس مصیبت بھری دنیا کی دو زندہ روحیں شام کو جنگل میں نکل جاتے۔ ڈوبنے والا سورج ہمارے سامنے سمندر میں دم توڑتا اور چمکنے والے تارے جھلملا جھلملا کر اندھیری رات کا پتہ دیتے۔ سردی کی تیز ہوا ہمارے سروں تک ہوتی۔ مگر وہ محبت بھری نظریں جو ہماری ایک دوسرے پر پڑتیں یقیناً تمام کائنات سے قیمتی تھیں۔

میں ایک ظالم بے فکر کے قرضہ میں جس کی ڈگری پچاس پاؤنڈ کی تھی دو ماہ کے لیئے جیل خانہ بھیج دیا گیا، مگر مجھ کو صرف پانچ دن گذرے تھے۔ کہ ایک فرشتہ رحمت نے میرا قرضہ ادا کر دیا، اور میں جیل خانہ سے چھوٹتے ہی اپنے گھر پہنچا آفسوس ایلینا مجھ کو گھر پر نہ ملی۔ مگر مکان کھلا ہوا میرے لینے کو بالکل تیار تھا میری تمام خوشی رنج سے بدل گئی۔ اور میں ایلینا کی تلاش میں باہر نکلنے ہی کو تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا ایلینا سامنے آئی۔ اور کہا۔

"آپ کہاں جاتے ہیں مجھے بھی ساتھ لیجیئے۔"

ناظرین یہ سن کر تعجب کریں گے۔ کہ یہ پچاس پونڈ جو میرے قرضہ کے ادا کئے گئے یہ ایلینا کے داخل کیئے ہوئے تھے جس نے صرف ایک مہینے کے واسطے ایک پڑوسی سے قرض لیئے تھے، مگر مہینہ گذرتے ہی اس ظالم سنگ دل نے میری آنکھوں کے سامنے ایلینا کو اس روپیہ کے عوض جیل خانہ بھجوا دیا۔ کونسا شوہر ہے۔ جو میری اس حالت کا اندازہ نہ کر سکتا ہو گا۔ میں نے ہر گلی کی خاک چھانی۔ شہروں میں بھیک

مانگی۔ امیروں سے التجا کی۔ دولتمندوں سے مدد چاہی، مگر ایک روح بھی اس ذلیل دُنیا کی ایسی نہ تھی جو پیاری ایلینا پر رحم کرتی۔ اس کو جیل خانہ پہنچے ہوئے اکیس راتیں گذر چکیں تھیں، کہ مجھ کو ایک تار ملا، کہ "میرے لاولد چچا نے انتقال کیا، اور پچاسی ہزار پونڈ بینک میں چھوڑے ہیں"

میری خوشی کی اس وقت کوئی انتہا نہ تھی۔ میں فوراً بینک گیا، اور سو پونڈ وصول کرکے جیل خانہ پہنچا کہ ایلینا کو چھوڑا کر لاؤں میں نے جس وقت یہ روپیہ داروغہ جیل کو دیا اُس نے ہنس کر میرا منہ دیکھا۔ اور کہا۔

"آپ کی بیوی ایلینا چونکہ پچھلے ہفتہ میں اپنی مشقت پوری نہ کرسکی اس لیے اس کو احتیاطاً ایک درجن بید کی سزا دی گئی۔ یہ سزا کچھ ایسی سخت تو نہ تھی، مگر خدا معلوم کیا وجہ تھی، کہ اُس کی کمر میں کاری زخم لگا۔ اور وہ آج صبح انتقال کرگئی ہیں پندرہ یا بیس منٹ ہوئے ہوں گے اس کی لاش کو دفن کروا چکا ہوں۔ مجھے افسوس کہ آپ کو تکلیف ہوئی، مگر ہم آپ کا روپیہ نہایت خوشی سے قبول کرتے ہیں"

مجھ پر کیا گذری۔ فرمانبردار بیویوں والے شوہر بتائیں، میں آج تک کہ چھ برس گذر چکے ہیں ہر جگہ اس صورت کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ کلیاں کھلتی ہیں مگر ایلینا نہیں ملتی۔ مدہم چاند روشن ہوجاتا ہے۔ مگر ایلینا نظر نہیں آتی، جنگل، اور باغ سرسبز درخت نظر آتے ہیں، لیکن ان میں بھی اس صورت کا جلوہ نہیں دکھائی دیتا۔ آسمان پر ابر کے چمکدار ٹکڑے جا بجا پھیلے ہوئے دیکھ رہا ہوں، اور آج یہ انتظار ہے، کہ عنقریب وہ پیاری صورت ان میں نظر آئے گی۔ ٹکٹکی بندھی ہوئی ہے اور ایک بدنصیب شوہر اپنی وفادار بیوی کے دیدار کا منتظر ہے۔

عصمت ۱۹۱۶ء

کیا لڑکیوں کی پیدائش ماں کا قصور ہے؟

میرے چچا صاحب نے جس وقت دوسرا نکاح کیا ہے، اور چچی جان پر سوکن آئی، اس وقت میری عمر دس برس کی تھی اور گو میں ابھی ان معاملات کو اچھی طرح نہ سمجھ سکتی تھی، مگر چچی جان کی افسردگی، خاموشی، اُن کا رنج و صدمہ دیکھ دیکھ کر میں اتنا ضرور سمجھتی تھی، کہ وہی چچی جان جو کنبہ بھر میں ہنس مکھ مشہور تھیں، جن کی باتوں سے سننے والوں کے پیٹ میں ہنستے ہنستے بل پڑ جاتے تھے، اُن کی حالت میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا تھا۔ بولتی ہیں، نہ چالتی، ہر وقت سر مُنہ اوندھائے پڑی رہتی ہیں۔ اس کی وجہ چچا جان کی نکاح کے سوا اور کچھ نہیں۔ میں اس معاملہ کو یہی نہ سمجھ سکتی تھی کہ نکاح کی یہ وجہ کہ اس بیوی سے اولاد نہ ہوئی، اور دوسری سے ہو درست ہے یا غلط۔ مگر میرے دل میں چچا جان کے اس فعل سے ایک قسم کی نفرت سی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ نفرت چچا جان کی حرکات سے اور بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ خاصے بڈھے آدمی تھے۔ اور چھوٹی بیوی مجھ سے چھ سات برس بڑی تھیں۔ انھوں نے نکاح کے وقت بھی۔ اور اس کے چند روز بعد تک بھی کہا کہ میں دونوں کو ایک آنکھ سے دیکھوں گا۔ مگر وہ اپنے قول سے دن بدن گیا، لمحہ بہ لمحہ دُور ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ مرنے سے پہلے جائداد اور مکان کیا گھر کی

گھوڑا گاڑی، مکان کا اسباب تک چھوٹی بیوی کے نام کر گئے۔

اُن کے انتقال کے وقت میں سولہ سترہ برس کی تھی۔ چھوٹی چچی نے عدّت کے بعد دوسرا نکاح کر لیا۔ مگر بڑی چچی جان باوجود میکے میں عزیزوں کے موجود ہونے کے سسرال سے جدا نہ ہوئیں۔ اپنا ذاتی روپیہ کرایہ جو جہیز میں ملا تھا۔ اُٹھایا، اور یہیں زندگی بسر کی۔ میں اپنے وقت کا بڑا حصّہ ان ہی کے پاس گزارتی۔ وہ چچی بھی تھیں، اور اُستانی بھی مجھ کو زندگی کے نشیب و فراز سمجھاتی تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کہ اُنہوں نے چچا جان کی اس بے اعتنائی کو کبھی میرے سامنے بے وفائی نہ کہا۔ بلکہ ہمیشہ اُن کو حق بجانب بتایا۔ میں جب ہوشیار ہو کر ان معاملات کو سمجھنے لگی ہوں تو ایک دفعہ جب اُنھوں نے کچھ تھوڑا سا کھانا پکوا کر اور خرید کر اُن کے نام سے یتیم خانہ بھیجے ہیں تو مجھے اُن کے اس فعل پر اعتراض ہوا۔ اور میں نے کہا "جس شخص نے آپ کی زندگی تباہ کر دی، اُس کے ساتھ آپ کی اس قدر محبّت اس کے مرنے کے بعد غلطی ہے۔" وہ یہ سُن کر رو دیں اور کہا۔

"عورت کا کام شوہر کی رضامندی حاصل کرنا ہے۔ اُنھوں نے اگر زیادتی کی تو اس کے ذمہ دار وہ ہیں۔ مسلمان عورت کی مغفرت شوہر کی رضامندی ہے۔ میں نے چونکہ زندگی بھر اسی اصول پر عمل کیا اس لئے آج بھی میرا تعلق ان کی روح کے ساتھ ویسا ہی ہے۔ وہ میرے نہ تھے، اور میرے ہو کر نہ رہے لیکن میں اُن ہی کی تھی، اور اُن ہی کی ہو کر رہوں گی۔"

چچی جان کی یہ منطق میری سمجھ میں نہ آئی، اور میں نے کہا "آپ کا یہ فرمانا کہ دوسرا نکاح کرنے میں اس لیے کہ پہلی بیوی سے اولاد نہ ہوئی حق بجانب تھے، درست نہیں۔ کیونکہ اولاد دوسری بیوی سے بھی نہ ہوئی، اُن کو دوسرے

نکاح سے پہلے یہ یقین دلانا چاہیے تھا کہ دوسری بیوی سے
اولاد کا ہونا یقینی ہے۔

(۲)

آج میری شادی کو گیارہ برس ہو گئے اس عرصہ
میں میرے ہاں سات لڑکیاں ہوئیں جن میں سے چھ زندہ ہیں۔
دو مہینہ سے میرے کان میں بھی یہ آوازیں آتی ہیں کہ اس عورت
سے چونکہ لڑکیاں پیدا ہوئیں اس لئے میرے شوہر کو دوسرا نکاح
کرنا چاہیے کہ لڑکا ہو۔ یہ بات اب تک میں نے کسی ذمہ دار آدمی
سے نہ سنی تھی۔ مگر دس بارہ روز کا عرصہ ہوا کہ خود شوہر صاحب
نے فرمایا کہ

"بغیر لڑکے کے خاندان کا نام زندہ نہیں رہ سکتا اور ایسی حالت
میں کہ میرا کوئی بھائی بھی نہیں ہے میرے بعد خاندان ختم ہو گا۔
ضرور ہے کہ میں خاندان کو زندہ رکھنے کے واسطے دوسرا نکاح کروں"
میں بچی جان نہ تھی کہ اس وجہ کے آگے سر جھکا دیتی۔"
میں نے کہا

"ایک سو دس روپیہ تمہاری تنخواہ ہے جو ہم آٹھ آدمیوں میں مشکل
سے کافی ہوتی ہے۔ اب دوسرا نکاح کس برتے پر؟ علاوہ ازیں لڑکیوں کی
پیدائش کی ذمہ داریں کس طرح ہو سکتی ہوں اور تمہارے پاس اس کا
کیا یقین ہے کہ دوسرے نکاح سے ضرور لڑکا پیدا ہو گا؟
ممکن ہے دوسرے نکاح سے اولاد ہی نہ ہو"

وہ یہ سُن کر خاموش ہو گئے، مگر مجھ سے بات چیت کرنی چھوڑ دی سُنتی ہوں کہ دوسرے نکاح کی تجویز ہو رہی ہے۔ نکاح تو خیر ہو یا نہ ہو مگر میں یہ کہتی ہوں کہ۔
"کیا لڑکیوں کی پیدائش ماں کا قصور ہے"

عصمت ۱۹۲۲ء
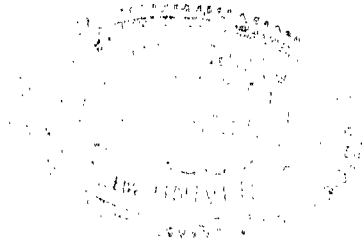
سلطانہ کے وعدہ کا انتظار

انقلاب تھا یا قہر خدا، مگر میرے واسطے وہ ساعت روزِ قیامت سے کم نہ تھی، جب میری چہکتی مینا جس کی بھولی بھولی باتیں دل پر بجلیاں گراتی تھیں ہمیشہ کو چھوٹ گئی، اور وہ کٹورا سی آنکھیں جو مٹک مٹک کر اور پھڑک پھڑک کر کلیجہ ٹھنڈا کرتی تھیں، ابدی نیند سوئیں۔ رات کا دوسرا حصّہ شروع ہو گیا تھا۔ جب چھ برس کی جان جہان سلطانہ کو آخری ہچکی نے میرے گھر سے وداع کیا، اور مرینہ کے سُرخ چادرہ میں بچی کے بجائے اس کا جسد خاکی رہ گیا۔ اس وقت اندرونی کیفیت تو جو کچھ بھی تھی، مگر بہ ظاہر میری عقل صحیح، میرے حواس درست، اور میرے ہوش بجا تھے۔ میں ٹکٹکی باندھے اس شئے کو دیکھ رہی تھی جس کے چہرہ پر چادرہ پڑا ہوا تھا، اور سوچتی تھی، کہ جس کی ہر ادا زندگی میں نہال نہال کر رہی تھی، وہ اب بیجان ہو کر خون کے آنسو رلوائے گی، جس کو کل تک زندہ دیکھا، وہ اب آنکھوں کے سامنے مردہ ہے۔ اور اس وقت جس کا مُردہ آنکھوں کے سامنے ہے کل اس کی قبر پیش نظر ہو گی۔

خیالات نے اندر ہی اندر پکنا شروع کیا، اور جب دل کو یہ یقین ہو گیا، کہ اب میں کہاں، اور سلطانہ کہاں، اس وقت بے بس بیتابانہ اُٹھی ایک چیخ ماری

اور بے قرار ہو کر اس کا منہ کھول، چاند سی صورت کو چمٹ گئی۔ دونوں بڑے لڑکے، اور لڑکی اور اُن کے باپ پاس بیٹھے تھے۔ جو جس سے ہو سکا، اور جس طرح کہہ سکا سمجھانے میں کسر نہ کی۔ مگر وہ رات روزِ حشر تھی، کہ دل رہ رہ کر تڑپتا، اور ہوک تھم تھم کر اُٹھتی تھی۔

صبح جسم بے جان کی وداع کا پیام لے کر بالآخر آ پہونچی، اور جو ہونا ہے۔ وہ ہو گیا۔ باپ کا رنج بہن بھائیوں کا افسوس، اور عزیز اقارب کا ملال رفتہ رفتہ کم ہونا شروع ہوا۔ لیکن سلطانہ کی موت میرے دل میں جو زخم ڈال گئی تھی، اس کی ٹیسیں، اور چبکیں لحہ بہ لحہ تیز ہو رہی تھیں۔ مجھے بچوں کا ہوش تھا نہ شوہر کا خیال۔ گھر کا فکر تھا نہ فرض کا احساس۔ سودائیوں کی سی کیفیت تھی، کہ ہر وقت سلطانہ کی تصویر آنکھ کے سامنے تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اب وہ کسی کونہ سے نکلی، اور "اماجان" کہہ کر گلے میں ہاتھ ڈالے۔ کیسی نیند، اور کس کی بھوک، راتیں آنکھوں میں کٹیں، اور دن انتظار میں گذرے اس غیر معمولی تغیر کا نتیجہ یہ ہوا گھر میں خاک اُڑنے لگی۔ آٹھ آٹھ دن بچّوں کے کپڑے نہ بدلے جاتے۔ والان بنئے کی دُکان، اور کمرے چوک کا بازار ہو گئے۔ کہیں بد قلعی کٹورے لڑک رہے ہیں۔ تو کسی جگہ بکس۔ اور یہاں گھی کا مرتبان دھرا ہے۔ تو وہاں کپڑے کے تھان۔ ماما ئیں گھر میں خدا کا شکر ہے دو دو، اور بچے "بھی اللہ کا فضل ہے" تین موجود تھے۔ مگر میرا انکس اُٹھتے ہی گھر کا گھروا ہو گیا۔ اور نوبت یہاں تک پہونچی، کہ شوہر بدنصیب بھوکا پیاسا کچہری گیا، اور اسی طرح آ کر پڑ رہا۔ میں گھر کی یہ گت، بچوں کی یہ حالت اور شوہر کی یہ مصیبت اپنی آنکھوں سے دیکھتی، مگر میرے دل کو جو لو لگی ہوئی تھی اس میں فرق نہ آتا۔

مرض الموت میں سلطانہ کی باتیں اس کا دفعۃً گھبرا کر ہاتھوں کی چوڑیاں اُتار کر بہن کو دیدینا اور یہ کہنا کہ "بس اللہ تم کو نصیب کرے" مرنے سے دو گھڑی پہلے میرے آگے ہاتھ جوڑ کر کہنا "اماجان میرا کہا سنا معاف کرنا" میرے دل پر پتھر کی لکیر تھے۔ ہر چند چاہتی تھی کہ بھلا دوں اور دنیا کے دھندوں میں پھنسوں لیکن چھ برس کی بیگم کسی طرح فراموش نہ ہوتی تھی۔ کلیجہ کے ٹکڑے اُڑتے تھے۔ دل ہوا ہوتا تھا۔ اور بیٹھے بیٹھے ایسی گھبراہٹ ہوتی تھی کہ جی چاہتا تھا۔ کپڑے پھاڑ کر جنگل کو نکل جاؤں۔

مرض ہوتا علاج کرتی۔ دُکھ ہوتا دَوا پیتی۔ لگی کا علاج کیا۔ اور پڑی کی دوا کیسی۔ یہاں تک ہو گیا کہ قبرستان میں جا پہونچتی اور گھنٹوں معصوم قبر کو چھاتی سے لگائے پڑی رہتی۔

عظیم الشان درخت قبرستان کے سناٹے میں میرے سر پر ہوتے اور سلطانہ کی ننھی قبر میری گود میں گھر کی کیفیت لمحہ بہ لمحہ بدتر ہورہی تھی۔ اور اب تو یہ حال تھا کہ کتے لوٹ رہے تھے بچے بلوں بلوں کرتے بھوکے سوتے اور شوہر لق لق کرتا دفتر جاتا۔

ایک دن کا ذکر ہے میں نماز صبح سے فراغت پا بچی کی قبر پر آئی موسم سرد تھا ہَوا زور شور سے چل رہی تھی اور میں سلطانہ کی یاد اور خدا کی تلاش میں قبر پر بیٹھی چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ املی کا ایک درخت آنکھ کے سامنے تھا اور سرسبز پتیاں ٹوٹ ٹوٹ کر زمین پر گرتی ہوئی دنیا کو فنا کا سبق دے رہی تھیں۔ دیکھتی کیا ہوں کہ گھنے پتوں میں ایک گھونسلا ہے جہاں ایک مینا اپنے بچہ کو لیئے بیٹھی ہے۔ بچہ ماکے پنجوں سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ آسمانی فضا میں پہلی مرتبہ اُڑ کر دنیا کی سیر کا لطف

اُٹھاؤں، ما اس کے ننھے ننھے بازو اور چھوٹے چھوٹے پروں کو چمٹ چمٹ کر پیار کر رہی، اور گویا کہہ رہی تھی، کہ ابھی معصوم بازو پوری پرواز کے قابل نہیں" پہلی پرواز کے اشتیاق نے بچہ کو بے قابو کر دیا، اور نادان کی ناتجربہ کاری نے مامتا کی ماری، ما کی تمام محنت، اور محبت خاک میں ملادی۔ معصوم اپنے تنکوں سے چل ہوا میں اڑا، مگر وہی گز چلا ہوگا، کہ چیل جو موت کی طرح سر پر منڈلا رہی تھی، بچہ پر جھپٹی، ما جس کا کلیجہ دہل رہا تھا، دشمن کے مقابلہ کو تیار ہوئی، لیکن کامیاب نہ ہوسکی، اور ظالم چیل نے بچہ کو پنجہ میں دبوچ لیا۔ چیں چیں کی دو تین آوازیں آئیں، اور اس کے بعد چیل، اور بچہ، دونو غائب تھے۔ البتہ بچہ کے ضائع ہونے والی ما، ایک ٹہنی پر خاموش بیٹھی تڑپ رہی تھی۔

میں اس بدنصیب ما کی کیفیت دیکھ رہی تھی، اور دل کہہ رہا تھا۔ کہ کیا اس کو اپنا بچہ میری سلطانہ سے کم عزیز ہوگا۔ کیا اس کا دل مجھ سے زیادہ نہ تڑپ رہا ہوگا۔ کیا اس کی مصیبت اس لئے کہ یہ جانور ہے۔ مجھ سے کم ہے۔

میں ان ہی خیالات میں غرق تھی، کہ نر اپنی مادہ کے پاس آکر بیٹھا، چپکے چپکے دونو کی کچھ باتیں ہوئیں، اور پھر دونو اُڑ کر روانہ ہوئے کی تلاش میں ادہر اُدہر پھرنے لگے۔

دوپہر ہو چکی تھی، کہ آسمان نے رنگ بدلا، اور سیاہ گھٹا نے اندھیرا گھُپ کر دیا، میں اُٹھی بچی کی قبر کو بوسہ دے کر بیٹھ گئی، اور سوچنے لگی، کہ سال بھر ہو چکا، مگر خدا کا دیدار رہوا نہ بچی کی شکل نظر آئی، کیا کروں کعبتہ اللہ جاؤں وہاں کامیاب ہوں گی۔ لیکن بچی کی ہڈیاں جن کو دیکھ کر تسکین ہو جاتی ہے۔ چھوٹ

جائیں گی۔

اسی فکر میں غلطاں پیچاں تھی۔ کہ اندھیرے میں ایسا معلوم ہوا گویا سلطانہ سامنے کھڑی مسکرا رہی ہے۔ صورت دیکھتے ہی تڑپ اٹھی چاہتی تھی، کہ آگے بڑھ کر گلے سے چمٹا لوں۔ کہ سلطانہ نے ہاتھ سے روک دیا۔ اور زبان سے کہا۔

"امّاں جان! خوشی اور رنج، پیدائش، اور موت دنیا کے کھیل، اور زندگی کے تماشے ہیں۔ ہر کیفیت بدلنے والی، اور ہر سماں فنا ہونے والا ہے۔ خوشی ختم ہو گی۔ اور رنج آخر۔ مبارک تھیں وہ مقدس ہستیاں جو حیات انسانی کے اس معمّہ کو حل کر گئیں، اور راحت ابدی حاصل کی۔

امّاں جان! جس خدا کی تلاش، جس جنّت کی جستجو، اور جس سلطانہ کا صدمہ ہے۔ وہ سب آپ کے پاس موجود ہیں۔ شوہر آپ کا خدا، گھر آپکی جنّت، اور بچّے آپ کی سلطانہ۔ ان کو چھوڑ کر یہاں سر پھوڑنا۔ اور حقیقی رشتے توڑ کر پتھروں سے ناطہ جوڑنا عقل سے بعید، اور انصاف سے دور ضرورت ہے، کہ مجاز سے حقیقت پر پہونچے۔ شوہر سے خدا، گھر سے جنّت، اور زندہ بچّوں سے مردہ بچّے پیدا کیجیے۔ نقصان پر صبر۔ انعام پر شکر۔ شیوۂ انسانیت ہے۔ ایسا نہ ہو کوئی اور صدمہ کلیجہ توڑ دے۔

جائیے، خدا حافظ۔ چھوڑیے سلطانہ، کو فانی تھی۔ انتظام کیجئے گھر کا۔ جنّت ہے۔ فکر کیجئے شوہر کا، خدائے مجازی ہے۔ پرورش کیجئے بچوں کی فرض ہے۔ اور تیار رہیئے۔ اس وقت کے واسطے، جو اصلی گھر میں لیجا کر حقیقی خدا کے روبرو پیش کرے گا۔

اگر شوہر کی اطاعت مکمّل بچّوں کی پرورش پوری، اور گھر کے فرائض ادا ہو گئے تو وعدہ کرتی ہوں، کہ موت کے بعد سب سے پہلے میں

یہ ہاتھ امّا جان آپ کے گلے میں ہوں گے"

سلطانہ کی تقریر میرے دل میں بیٹھ گئی اور میں نے گھر آ کر شوہر کے قدموں پر سر رکھا، بچّوں کو کلیجہ سے لگایا گھر کے کاروبار میں مصروف ہوئی اور اب اس وقت کی منتظر ہوں جب سلطانہ میرے کلیجہ سے چمٹ کر اپنا وعدہ پورا کرے۔

عصمت ۱۹۱۹ء

دو معصوم آنسو

احمد میاں۔

اسلام و دعا۔ ہجوم افکار کے ساتھ تم سے رخصت ہوئی، اور پریشانیوں کا انبار لے کر لاہور پہونچی۔ خیال یہ تھا کہ تمہارے آنکھ سے اوجھل ہونے پر تکالیف کا وزن کم اور افکار کی تعداد گھٹ جائے گی۔ مگر نتیجہ اُلٹا، اور تعبیر غلط نکلی۔ تم سامنے تھے، تو دل کو پھر تسکین تھی۔ دُور ہو کر بالکل ہی مجبور ہو گئی۔ بھائی اس طرح آخر کب تک گذارو گے۔ بیویاں دُنیا کی مرتی آئی ہیں، مگر یہ سوگ کسی نے نہیں کیا کہ خواہ مخواہ کا روگ لگا بیٹھے۔ جیتی جان کے ساتھ ہزار ضرورتیں ہیں۔ بھلا گھر کے کام کہیں نوکروں سے چلے ہیں۔ کھانا کام مرد کا، اور اُٹھانا عورت کا۔ اور پھر جوان بچّی کا ساتھ! ذرا سی اونچ نیچ میں دُنیا نکّو بنا لے ان خیالوں کو چھوڑو، اور وہموں سے باز آؤ۔ اپنے اوپر نہیں تو بچی ہی پر رحم کرو۔ بھلا چار برس کی جان۔ کھیلنے کودنے کے دن۔ پھرنے اُچھلنے کا وقت۔ یا ہر وقت تمہاری ٹانگ سے ٹانگ باندھے چپکا ہے جانے کی اجازت نہ بولنے کا حکم۔ ملنے کی آزادی نہ چلنے کا اختیار۔ گھر میں ماں ہو گی، سگی نہیں سوتیلی سہی پھرے گا چلے گا۔ کھیلے گا مالے گا۔ ہنسے گا، بولے گا۔ دل چونچال، اور چہرہ بحال ہو گا۔ بھائی ہوئی گرداں ہوئی نہ کرو۔ تمہاری بیوی انوکھی نہیں مریں۔ مرتی ہیں، اور ہوتا ہے جاتی ہیں اور آتی ہیں

بڑی اماں سمجھاتے سمجھاتے ہار گئیں۔ چچا ابا کہتے کہتے تھک گئے تمہارے کان پر جوں نہیں چلتی۔ ایسی خودسری اور اکھڑ اپن بھی کس کام کا۔ تم کو اپنی جان کا اختیار ہے۔ شوق سے گھلا دو مگر معصوم بچوں نے کیا گناہ کیا ہے۔ کہ ان کی جان کے پیچھے پڑ گئے۔ خدا کی قسم احمد میرا تو کلیجہ کٹ گیا جب سرودی نے کہا "ہم نے تو ابھی خربوزے نئے نہیں کھائے" بھائی اس کے کھانے پینے کی یہ ہی عمر اور یہی وقت ہے پھر تو کون کھاتا اور پیتا ہے۔ کواریوں کو بیاہا اور بیاہیوں کو گھر والا دیکھ لیا۔ دوسروں کو کیا دیکھا اپنے ہی اوپر سب کچھ گذر گئی۔ بے فکری کے دن جو کوار پنے میں گذرے اب مر کر بھی میسر نہ ہوں گے۔

لنڈورے بن کر کب تک جیو گے اور جیو گے تو کس طرح جیو گے؟ کنبہ میں عزت نہ خاندان میں وقر۔ دو نو بچوں کو لئے الگ کونہ میں پڑے رہو۔ کہیں آنے کے نہ جانے کے۔ ملنے کے نہ جلنے کے۔

میں نے تم سے زبانی بھی کہا تھا کہ میرے پڑوس میں تحصیلدار رہتے ہیں۔ ان کی لڑکی شکل صورت، ہنر سلیقہ، غرض دسوں انگلیاں دسوں چراغ ہیں۔ ایسی ہیرا لڑکی چراغ لے کر ڈھونڈ ہو گے تو نہ ملے گی۔ اور پھر مسکین ایسی کہ منہ میں زبان ہی نہیں۔ محنتی اتنی کہ دن بھر ایک ٹانگ سے پھرتی ہے۔ تیرہ برس کی بچی سارا گھر سنبھالے ہوئے ہے۔ اور کیا مجال جو کسی کو رتی بھر تکلیف ہو جائے۔ میں نے اترتے ہی ان کا عندیہ لیا۔ ادھر تمہارے بھائی صاحب نے تحصیلدار کو ٹٹولا۔ دونو میاں بیوی راضی ہیں۔ اب تم جمعرات کو یہاں آجاؤ تو جمعہ کو نکاح ہو جائے۔

احمد بھائی! میری زندگی کیوں برباد کرتا ہے۔ دس برس کی مرتی دو ہی برس میں مر جاؤں گی۔ تمہارا گھر بس گیا تو اس رنج سے چھوٹ کر شاید کچھ

دن اور جی لوں، اچھی میرا بھائی میری بات جھوٹی نہ پڑے۔

تمہاری بہن ظہیرہ

صبح سات بجے کا آیا ہوا یہ خط گیارہ بجے تک احمد کے ہاتھ میں تھا۔ وہ بار بار پڑھتا تھا اور غور کرتا تھا کبھی ہنستا تھا۔ کبھی تیوری پر بل ڈالتا تھا اور خاموش ہو جاتا تھا۔ اس نے اس وقت خط پھر اٹھایا۔ اوّل سے آخر تک پڑھا مسکرایا، اور کھڑا ہو گیا۔ خاموش تھا کہ سامنے سے اس کا چچازاد بھائی سعید جو اس کے نکاح ثانی کے واسطے بے حد مُصر تھا، ہنستا ہوا آیا اور کہنے لگا۔

"بھئی احمد کہو کس نتیجہ پر پہونچے اگر آپا ظہیرہ کی بات بھی ٹال دی تو کمال کیا"

احمد "نہیں میں اُن کی بات تو نہ ٹالوں گا۔ یہ محض خون کا جوش ہے جو وہ اس قدر فکر کر رہی ہیں۔ اور تمہاری بھی محبّت ہے کہ مجھے آمادہ کر رہے ہو مگر بھائی سعید میں یہ تو تم سے بارہا کہہ چکا ہوں کہ وہ لوگ جو نکاح ثانی کی یہ وجہ پیش کرتے ہیں کہ اولاد کی پرورش ہو جائے گی دوسروں کو دیوانہ بناتے ہیں۔ آپا جان نے تو کمال کیا کہ شادی کی تمام ضرورت بچّوں کے سر تھوپ دی۔ سوتیلی ماں اگر فرشتہ انسان ہے تو بھی انسانی فطرت سے علیحدہ نہیں ہو سکتی، اور انسانی فطرت اس قسم کی شرکت کسی حال میں گوارا نہیں کر سکتی۔ یہ ہی وجہ ہے کہ حقیقی خالائیں سوتیلی ماں بن کر بھانجا بھانجی کی دشمن ثابت ہوئی ہیں۔ میرے دل میں محبّت کا جو حصّہ ان دونوں بچوں کے واسطے موجود ہے جس قدر روپیہ پیسہ کا مالک ہوں، تم میری محنت اور آرام کے واسطے میرے ہی اطمینان اور آسائش کی خاطر سہی مگر اس میں ایک تیسرا شریک پیدا کر رہے ہو۔ میں آپا جان کی خواہش اور تمہاری خوشی

پوری کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ چلو جمعرات کو چلیں اور جمعہ کو دلہن بیاہ لائیں۔ مگر پیارے سعید! ایک بات کہوں گا۔

بچوں کو جو نقصان پہونچ گیا اس کی تلافی محال۔ ان سے جو دولت چھن گئی وہ اب میسّر آنے والی نہیں۔ یہ متفقہ فیصلہ ہے، کہ ماں کے بعد جو آسائش و راحت بچوں کو باپ کی آغوش میں نصیب ہے۔ سوتیلی ماں کا وجود اگر اس کو فنا نہیں تو رفتہ رفتہ کمزور ضرور کردے گا۔ میں اگر یہ کہوں کہ میری خانہ بربادی اب ان بچوں کی شادی ہے۔ اور میری شادی ان بچوں کی خانہ بربادی، تو میرا یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا، مگر میں یہ نہیں کہتا، اور صرف اتنا کہتا ہوں حقیقی بہن، اور چچازاد بھائی، یعنی آپا جان اور تم جس بھائی کی راحت و آسائش کا اس قدر فکر کر رہے ہو۔ اس کے بچوں کا مستقبل بھی تمہارے دماغ پر کوئی حق رکھتا ہے؟

آج تم اور آپا جان دونوں اس نکاح سے فارغ ہو کر باغ باغ ہو جاؤ گے مگر جس وقت پیارا اعجاز سوتیلی ماں کی کسی خاموش زیادتی سے متاثر ہو کر دیوار کی طرف منہ کر کے دو آنسو گرا کر کرتے سے آنکھیں پونچھ کر رنج کے چھپانے کی کوشش کرے گا، کیا اس وقت بھی جس بھائی کی خانہ بربادی سے اس قدر مضطرب ہو اس کے بچہ کو دیکھنے کی کوشش کروگے؟

آہ! سعید، وہ معصوم آنسو تم کیا میں بھی نہ دیکھوں گا

عصمت، ۱۹۲۰ء

مصوّرِ غم

مصورِ غم حضرت علامہ راشد الخیری (خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) شاہجہاں آباد کے اُس مقتدر اور ممتاز خاندان کے فرزند رشید تھے جسے خاندان شاہان مغلیہ کے اُستاد ہونیکا نسلاً بعد نسلاً فخر حاصل رہا جس نے مولوی عبد الخالق صاحب مرحوم مولوی عبد القادر صاحب مرحوم اور ہندوستان کے مشہور سحر البیان مولوی عبد الرب مغفور، بانی جامع مسجد سہارنپور جیسے جیّد علما اور قرآن و حدیث کے نامور ماہرین پیدا کئے، یہ اجڑے دیار کا وہ نامور خاندان تھا جس کی بیٹیاں حافظ، حاجیہ قاریہ اُم عطیۃ النسا مرحومہ (چھوٹی استانی جی) اور حاجیہ ام ذکیہ مرحومہ جیسی مشہور عالمہ فاضلہ خواتین اور جس کے داماد شمس العلماء مولوی نذیر حسین مرحوم "محدث دہلی" اور شمس العلما مولوی نذیر احمد مرحوم جیسے نامور بزرگ تھے۔ حضرت علامہ مغفور بمقام دہلی جنوری ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے، اور ابھی نو دس برس ہی کے تھے کہ ان کے والد ماجد مولوی حافظ عبد الواجد صاحب نے حیدر آباد دکن میں جہاں وہ محکمہ بندوبست میں افسر اعلیٰ تھے۔ انتقال فرمایا، اور حضرت علامہ مرحوم کی تعلیم و تربیت ان کے دادا اور چچا حضرت مولوی عبد القادر صاحب مرحوم اور خان بہادر مولوی عبد الحامد صاحب مرحوم ڈپٹی کلکٹر کی نگرانی میں ہونے لگی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی تعلیم کو مسلمان کفر سمجھ رہے تھے۔ اس لئے حضرت علامہ مغفور نے اُردو فارسی عربی وغیرہ گھر پر پڑھی۔ پھر انگریزی تعلیم دہلی کے عربک اسکول میں ہوئی۔ مگر انہوں نے اپنے شوق سے اس کو بہت کچھ ترقی دی۔ مولوی نذیر احمد مرحوم (جو علامہ مرحوم کے حقیقی پھوپا تھے) اور مولانا حالی مرحوم کی شاگردی نے علامہ مغفور کی قابلیت کی ترقی میں چار چاند لگا دیے۔ ابھی حضرت علامہ انٹرنس ہی میں تھے کہ ان کی ذہانت کا چرچا ہونے لگا۔

تکمیل تعلیم کے بعد مولوی عبد الرحیم صاحب بانی جامع مسجد جھجر کی اکلوتی

صاحبزادی سے جنوری ۱۸۹۰ء میں شادی ہوئی اور ۱۸۹۱ء میں محکمہ بندوبست کے انگریزی دفتر میں ملازمت شروع کی مگر ملازمت کی پابندی حضرت علامہ کی طبیعت کے خلاف تھی۔ اور دفتر کے خشک کاموں میں جی نہ لگتا تھا اس پر یہ کہ مرحوم کی والدہ مرحومہ اپنے اکلوتے بیٹے کی جدائی زیادہ روز کے لئے گوارا نہ کرسکتی تھیں۔ ان وجوہ سے جم کر ایک جگہ نوکری نہ کی اور ترقی کے نہایت معقول مواقع میسر آنے پر ان کی طرف مطلق توجہ نہ فرمائی اور اناؤ، کھیری، میرٹھ، علی گڈھ، دہرہ دون کی تبدیلی ہوتی رہی آخر دلی کے پوسٹل آڈٹ آفس میں تبدیل ہوئے مگر چند سال گذرے تھے کہ ۱۹۱۰ء میں اٹھارہ انیس سال کی ملازمت سے استعفا دے دیا۔

حضرت علامہ راشد الخیری رحمتہ اللہ علیہ کی سب سے پہلی تصنیف "حیات صالحہ یا صالحات" ہے جو ۱۸۹۵ء میں لکھی گئی ۱۸۹۸ء میں دوسری تصنیف "منازل السائرہ" ختم کی۔ ان دونوں اصلاحی ناولوں کی اشاعت کے بعد حضرت علامہ مغفور کا شہرہ ایک مقبول و بلند پایہ مصنف کی حیثیت سے بلند ہونا شروع ہوا۔ ۱۹۰۳ء سے رسالہ مخزن میں افسانے اور مضامین شائع ہونے لگے پھر "صبح زندگی" شائع ہوئی اور دلی کے باکمال ادیب کی طرز تحریر کی دلآویزی، زبان کی شیرینی اور واقعات کے پیرایہ بیان کی درد انگیزی کی دھوم مچنے لگی۔ ۱۹۰۸ء میں خواتین کے لئے رسالہ "عصمت" جاری ہوا جو ۲۸ سال سے برابر شائع ہو رہا ہے اور ہندوستان کا بہترین زنانہ پرچہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ ۱۹۱۱ء میں حقوق نسواں کی حمایت میں رسالہ "تمدن" جاری کیا جو ۵ سال تک بڑی خوبی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتا رہا۔ ۱۹۱۵ء میں اخبار "سہیلی جاری" فرمایا مگر ۱۹۱۶ء میں دفتر عصمت میں قیامت کی آگ لگی اور سہیلی جاری نہ رہ سکا ۱۹۱۷ء میں "شام زندگی" شائع ہوئی اور اسے وہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ پہلے ہی سال میں تین مرتبہ چھپی اور کتاب نے قوم سے حضرت علامہ مغفور کو مصور غم کا خطاب دلوایا۔ اب اردو کے بے مثل مصنف نے تصانیف کا ڈھیر لگا دیا اور دو درجن کے قریب ضخیم کتابیں [illegible] سے ۱۹۲۳ء تک کے زمانہ میں لکھ ڈالیں، جو مختلف حضرات نے شائع کیں اور بقول مولانا تاجور "لاکھوں روپیہ پیدا کیا" حضرت مصور غم نے اپنی تصانیف کی جو مقبولیت دیکھی شاید اردو کے کسی مصنف کو اپنی زندگی میں دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ ایک دو نہیں درجنوں کتابیں آٹھ آٹھ دس دس سال کے عرصہ میں دس دس بارہ بارہ دفعہ چھپیں بلکہ "صبح زندگی"

شامِ زندگی وغیرہ کے تو پندرہ پندرہ بیس بیس ایڈیشن شائع ہوئے - آخری دو کتابیں "امنہ کا لال" "سیدہ کا لال" بھی چار ساڑھے چار سال میں ہزارہا کی تعداد میں پانچ چھ دفعہ چھپ کر ہاتھوں ہاتھ نکل گئیں -

۱۹۱۸ء میں پنجاب یونیورسٹی نے اُردو کورس علامہ مغفور سے صحیح کرائے ۱۹۲۰ء میں نیشنل یونیورسٹی نے سب سے پہلا اردو ممتحن مقرر کیا ۱۹۲۷ء میں حکومت بہار واڑیسہ نے شمالی ہند سے بہ حیثیت ماہر اُردو کے اردو ہندی کی ترقی کے سلسلے میں حضرت علامہ مرحوم سے بیش بہا مشورے لئے -

۱۹۲۲ء میں مسلمان بچیوں کیلئے "تربیت گاہ بنات" قائم کی جس سے ہندوستان کے مختلف حصوں کی سینکڑوں خوشحال اور یتیم و نادار بچیوں نے بحیثیت بورڈر تعلیم و تربیت حاصل کی اور جس سے ہزاروں غریب کم استطاعت بچیاں زیورِ تعلیم سے آراستہ ہوئیں - اس مدرسہ کیلئے بیگم صاحبہ محترمہ کے ساتھ علامہ مغفور باوجود پیرانہ سالی کے ہندوستان کے کسی صوبہ کا سال میں مہینہ سوا مہینہ کا دورہ فرماتے تھے - مدرسہ کے کاموں میں محترمہ بیگم راشد الخیری صاحبہ حضرت علامہ مرحوم کی برابر کی شریک رہیں ۱۹۲۷ء میں مسلمان بچیوں کے لئے رسالہ "بنات" جاری فرمایا ۱۹۳۳ء میں علامہ مغفور کی مرحومہ بہو محترمہ خاتون اکرم کی یادگار میں زنانہ دستکاری کا رسالہ "جوہر نسواں" جاری ہوا - حضرت علامہ راشد الخیری کی (خدا انہیں غریقِ رحمت فرمائے) خودداری بڑے آدمیوں اور با اثر و با رسوخ لوگوں سے ملنے جلنے کو کبھی درست نہ سمجھتی تھی - نام و نمود، شہرت و خودستائی جلسوں اور بے نتیجہ تقریروں سے سخت نفرت تھی - کسی جلسہ یا کسی تحریک میں حصہ نہ لیتے تھے - حضرت مصورِ غم نے خاموشی کے ساتھ مسلسل چالیس سال تک تصانیف اور رسالوں کے ذریعہ خواتینِ ہند اور ادبِ اُردو کی جو زبردست شاندار خدمات انجام دیں وہ اس قدر گراں بہا اور عظیم الشان ہیں کہ مشہور ادیبوں اور رہنمایانِ قوم کا فیصلہ ہے کہ ان کی نظیر نہیں نکل سکتی - اصلاحِ نسواں اور حقوقِ نسواں کیلئے حضرت علامہ راشد الخیری علیہ الرحمۃ کی کوششیں کبھی فراموش نہ ہو سکیں گی - مصورِ غم ہی کی تحریروں سے عورتوں کی مظلومیت پر مردوں کے دل پسیجے، مصورِ غم ہی کے لٹریچر سے عورتوں کو اپنی اصلاح اور ترقی کا احساس پیدا ہو گیا اور گذشتہ تہائی صدی میں خواتینِ ہند میں جو تھوڑی بہت بیداری پیدا ہوئی ہے متفقہ طور پر اس کا اعتراف کیا گیا ہے کہ اس میں بڑا اور بہت بڑا حصہ جنت نصیب حضرت علامہ راشد الخیری کی ان تھک مسلسل کوششوں کا نتیجہ ہے - حضرت مصورِ غم علیہ الرحمۃ مشرق کے بے مثل حزن نگار مصنف ہی نہ تھے مزاحیہ مضامین لکھنے میں بھی کمال رکھتے تھے - ناولسٹ بھی تھے

جرنلسٹ بھی، مختصر افسانہ نگار بھی تھے، اور مورخ بھی۔ شاعر بھی تھے اور انشا پرداز بھی، مگر ہر حیثیت میں
مصلح اور نسوانی جذبات کے ترجمان۔ انکی تحریر کی طرح انکی تقریروں اور لکچروں میں بھی خدا نے کچھ ایسا اثر اور آواز
میں کچھ ایسا درد عطا فرمایا تھا کہ مجمع زار و قطار آنسو بہاتا تھا۔ حضرت علامہ مغفور میں مذہبی عنصر بہت غالب
تھا زمانہ شباب میں علاوہ مذہب کے فارسی شاعروں اور انگریزی مصنفین کا بھی مطالعہ فرمایا تھا، حافظہ حیرت
انگیز تھا، موسیقی سے بہت دلچسپی تھی۔ انگریزی اور ہندوستانی بہت سے کھیل جانتے تھے، بدن کسرتی تھا۔
جسم دوہرا، قد لمبا، چہرہ پر دلالت اور نور برستا تھا۔ خانگی زندگی انتہائی کامیاب تھی اور دیکھنے والوں کیلئے
ہر حیثیت سے قابل رشک تھی۔ بے نظیر بیٹے، لاجواب بھائی، سعادتمند داماد، بہتیں شوہر، عاشق زار باپ،
اور بہترین دوست، ہمیشہ شاداں و خنداں رہتے تھے۔ انکی بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی، اور زندہ دلی ان کے ملنے والے
بھلائے سے بھی نہیں بھول سکتے۔ جنکی قابلیت کا چار کھونٹ ڈنکا بج رہا تھا، جنکی شہرت اس دور کے بڑے
بڑے مصنفوں اور رہنماؤں کیلئے باعث رشک تھی، جنکا نام عزت کے ساتھ، جنکا ذکر محبت کے ساتھ لیا جاتا اور
کیا جاتا تھا، ان کی شرافت اور اخلاق، سادگی اور وضع داری، مہمان نوازی اور انسانی ہمدردی دیکھنے والوں کو
حیرت میں ڈال دیتی تھی۔ انکی عاجزی اور انکساری کا یہی ثبوت کچھ معمولی نہیں کہ ۶۰ کے قریب کتابیں زندگی میں شائع
ہوگئیں لیکن کسی کتاب میں تصویر نہ شائع کرنے دی۔ کسی کتاب کو کسی کے نام منسوب نہ کیا۔ کسی کتاب میں
کسی کی تقریظ جائز نہ سمجھی۔ تین چار کتابوں میں دیباچے بھی مجبوراً لکھے ورنہ سوائے ٹائٹل پر نام آنے کے
اپنا نام تک اپنی کتاب میں دوبارہ آنا پسند نہ فرمایا۔ صبر و شکر، توکل و قناعت ہمیشہ شیوہ رہا۔ اپنی حالت
میں بے انتہا خوش رہے۔ رحمدلی، مخلصانہ عملی ہمدردی، غیروں کی آگ میں کود پڑنا، دوسروں کیلئے سب کچھ
لٹا دینا المختصر خدمت خلق اللہ حاصل عمر تھا۔ ۶۸ سال کی عمر تھی اور بظاہر صحت نہایت اچھی کہ
دو ماہ بیمار رہ کر ۳ فروری کی منحوس صبح کو اجڑے دیار کے آخری باکمال مصنف کا سایہ قوم بدبخت کے سر سے
اُٹھ گیا۔ مصور غم کی رحلت پر ہندوستان بھر کے ہر پڑھے لکھے گھرانے میں کہرام مچ گیا۔ جگہ جگہ زنانہ
اور مردانہ ماتمی جلسے ہوئے، اور ہندوستان کے باہر ادب اُردو کا ذوق رکھنے والا ہر شخص دم بخود ہو گیا۔
جسقدر رنج و غم میں ڈوبے ہوئے مضامین، جتنے مرثیے، نوحے، قطعات تاریخ المختصر جسقدر بلند پایہ ماتمی لٹریچر
مصور غم کے انتقال پر شائع ہو گیا وہ اتنا زبردست ہے کہ بقول اڈیٹر ملت "کسی ادیب یا رہنما کی وفات پر اسوقت تک
شائع نہ ہو سکا"۔ آسمان کتنی ہی کروٹیں بدلے، زمین کتنے ہی چکر کاٹے، ہندوستان بدلے، ہندوستان والے بدلیں،
معاشرت بدلے، ادب بدلے، لیکن مصور غم حضرت علامہ راشد الخیری کو ہمیشہ عزت و محبت کیساتھ یاد کیا جائیگا۔
انکا نام آیندہ نسلیں فخر کیساتھ لیتی رہیں گی۔ خدا کی بیشمار رحمتوں کے پھول اُس مزار مبارک پر برستے رہیں جسمیں
وہ میٹھی نیند سو رہے ہیں، اور خدا جنت نعیم میں اس پاک روح کو ابدی سکون عطا فرمائے، جس کی دائمی
مفارقت میں آٹھ آٹھ آنسو رلا رہی ہے۔ ۲۲ جولائی ۱۹۳۶ء رازق الخیری

افسر نسوانِ ہند محترمہ خاتونِ اکرم جنّت مکانی کی یادگار میں

جوہر نسواں دہلی

زنانہ دستکاری کا ماہوار رسالہ ۱۹۳۴ء سے جاری ہے

دفتر عصمت دہلی کے اس ماہوار رسالہ میں کشیدہ۔ کروشیا۔ جالی۔ تار کشی۔ ارپٹ کینوس۔ کراس اسٹیچ۔ سلمہ ستارہ۔ رین تپی۔ کٹاؤ اور کپڑوں کی سلائی۔ کٹائی وغیرہ وغیرہ مختلف قسم کی زنانہ دستکاریوں کے عمدہ عمدہ نمونے اور مفصل ترکیبیں اور کار آمد ہدایتیں شائع ہوتی ہیں جوہر نسواں کے مضامین پھوہڑ لڑکیوں کو بھی سگھڑ اور ہنرمند بنا دیتے ہیں جوہر نسواں کی قلمی معاونین ہندوستان کی مشہور دستکار خواتین ہیں۔ اور اڈیٹر مقبول و مشہور کتابوں کی مؤلفات۔ سال میں دو خاص نمبر شائع ہوتے ہیں جو کسی موضوع پر بہترین مستقل کتابیں ہوتی ہیں۔

ٹائیٹل نہایت خوبصورت کاغذ چکنا دبیز لکھائی چھپائی مصوری اعلیٰ درجہ کی۔

سالانہ چندہ۔ مع محصول دو روپے آٹھ آنے۔ فی پرچہ ۴ر

دفتر عصمت کی کچھ اور کتابیں

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
بی کا کام	عہ	ادب زریں	۸ر	افسانہ حرم ۸ر، فیروزہ	۸ر
بتیوں کا کام	عا	نغمات موت	۶ر	آئینہ موکڑ	عہ
ستارہ کا کام	عا	خانہ داری کے تجربات	۱۲ر	سنگھار خانہ	عا
...ی کام سلائیوں سے	عہ	مفید نسواں	۸ر	تندرستی ہزار نعمت	۵ر
آئین کی دستکاریاں	۸ر	جاں باز	۱۲ر	زنانہ لبستہ عہ، شمع خاموش	۶ر
...پانی کہانیاں	عہ	دامن باغباں	عہ	پردہ تعلیم	۱۲ر
...زیدار کہانیاں	۵ر	روحانی شادی	۶ر	صنعت و حرفت	عا
...ہید وفا	۵	آئینہ جمال	۱۲ر	زچہ خانہ	[illegible]

(مطبوعہ محبوب المطابع برقی پریس دہلی)